محمد اقبال بٹ
دارالکتاب

طیب عثمانی ندوی

دارالکتاب۔ گیا

ملنے کا پتہ

مینجر دارالکتاب، منیا گدام - گیا

ہماری ایجنسیاں

دہلی :- اسلامی کتاب گھر، اُردو بازار- دہلی
پٹنہ :- مکتبہ کتاب منزل، سبزی باغ - پٹنہ ۴
رانچی :- تاج بک ڈپو، مین روڈ - رانچی
دربھنگہ :- مکتبہ اسلامی، لہیریا سرائے - دربھنگہ
گیا :- ظفر بک ڈپو، کچہری روڈ - گیا
سملہ :- مینجر دارالکتاب سملہ پاک، ڈاکخانہ قاسمہ گیا

طبع اول ——— اگست ۱۹۶۱ء
تعداد ——— ایک ہزار
قیمت ——— تین روپے

مطبوعہ تاج پریس۔ باری روڈ گیا

فہرست مضامین

والدِ مکرم

حضرت شاہ محمد قاسم عثمانی فردوسی رحمۃ اللہ علیہ

کے

نام

جن کی صحبت ، تربیت اور نصیحت

نے

مجھے اس لائق بنایا

طیّب عثمانی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سرودِ رفتہ باز آید کہ ناید
نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارے ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

اقبالؒ

تاریخ پیدائش :- ۱۸۷۳ء

تاریخ وفات :- ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء

طیب عثمانی ۱۲ جون ۱۹۶۱ء
دارالکتاب، سملہ پاک
گیا (بہار)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

از جناب ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب پرو وائس چانسلر
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

طیّب عثمانی صاحب نے اپنی اس تصنیف میں فکرِ اقبال کا تجزیہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں کیا ہے۔ ان کا یہ طریق کار درست اور قابلِ تحسین ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اقبال کے کلام اور پیام کو اسلامی تعلیم کی روشنی ہی میں سمجھا اور پرکھا جا سکتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے دانتے کی شاعری کو مسیحی مذہب کو جانے بغیر سمجھنا ممکن نہیں۔

یہ کتاب نو بابوں پر مشتمل ہے، جن میں اقبال کے وہ تمام

بنیادی تصورات آ گئے ہیں جن سے معاشرتی اور تہذیبی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ کتاب خاص طور پر نوجوانوں کے لئے لکھی گئی ہے تاکہ وہ اقبال کے خیالات سے بصیرت حاصل کریں، مصنف نے خود لکھا ہے۔

"اس کتاب میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ کالج کے طلبہ اور ملت کے نوجوانوں کے سامنے اقبال کا کلام وپیام صحیح معنوں میں آجائے اور وہ اقبال کے "سوز جگر" اس کے "عشق" اور اس کے "نور" اور "نظر" سے واقف ہوجائیں"

مصنف نے اقبال کے بنیادی تصورات کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ ہمیں پوری توقع ہے کہ انہوں نے اس کتاب کی تصنیف سے اپنے پیش نظر جو مقصد رکھا ہے اس میں انہیں کامیابی ہوگی، اور ملک کے نوجوانوں کو شاعر مشرق کے کلام وپیام کی روح تک رسائی حاصل ہوجائے گی۔

اقبال کے کلام کی ادبی اور شاعرانہ حیثیت تو مسلّم ہے۔ اس کے علاوہ اس کے یہاں تہذیبی مسائل کی نسبت جو اشارے ملتے ہیں وہ بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ گزشتہ تین سو سال میں زندگی جس ڈگر پر چل رہی ہے وہ خطروں سے خالی نہیں۔

سائنس نے انسان کی قوت کو بہت بڑھایا ہے یہاں تک کہ اب وہ
عالم بالا پر اپنی کمندیں پھینکنے لگا ہے۔ اپنے علم کے ذریعہ وہ
اشیاء کی قلب ماہیت کرکے انہیں اپنے مفید مطلب بناتا ہے۔
لیکن باوجود فطرت کے تسخیر کرنے کے انسان اپنے وجود میں تضاد
اور الجھن محسوس کر رہا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے فطرت پر
اپنے اخلاقی ظرف سے زیادہ قابو پالیا ہے۔ ایٹم کی دریافت سے
اس کا قابو فطرت پر بہت بڑھ گیا ہے۔ آج اس کے سامنے
یہ مسئلہ ہے کہ وہ اپنے علم کو زندگی کی فراوانی کے لئے استعمال کرے
یا انسانیت کو تباہ و برباد کرنے کے لئے۔ یہ ایک اخلاقی سوال ہے
جسے اس کو حل کرنا ہے۔ اقبال کے کلام میں اس سوال کا
جواب موجود ہے اس لئے کہ وہ تمام انسانی مسائل کو
حل کرنے کے لئے اخلاق و مذہب کا سہارا لینا ہے۔ اس نے
روحانی اور مادی زندگی کی مفاہمت کا جو تصور پیش کیا ہے
وہ اسلامی تعلیم کے موافق ہے۔ انسانی زندگی کا اصل مقصد
انسانیت کے شرف و وقار کو بڑھانا ہے، جس کی طرف اقبال نے
بار بار اپنے کلام میں اشارہ کیا ہے۔ اس نے انسانیت کے لئے
ایک نئے اخلاقی توازن کو ضروری بتایا ہے جس کے بغیر زندگی کو

صحیح راہ عمل نہیں مل سکتی ۔

مصنف نے ان تمام تہذیبی مسائل پر روشنی ڈالی ہے، جو اقبال کے کلام میں ملتے ہیں، کتاب کا انداز تحریر دلکش ہے۔ امید ہے کہ ہمارے نوجوان اس کتاب سے پوری طرح استفادہ کریں گے ۔

یوسف حسین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حدیثِ اقبال

حدیثِ اقبال میرے لئے "حدیثِ دلبراں" سے کم نہیں، غالب نے کہا تھا ؏ "ذکر اُس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا" —— اور "اُس پری وش" کے ذکر کے لئے غالب کی زبان نے جو گلہائے رنگ رنگ کھلائے ہیں، اس سے اردو شاعری پر بہار آئی ہے اور جو سدا بہار رہے گی۔ حدیثِ اقبال اگرچہ میرے لئے حدیثِ دلبراں ہے، لیکن غالب کی وہ زبان، جو صرف انہیں کا حصہ تھا اور رہے گا، کہاں سے آسکتی ہے اور اب یہ کون کہہ سکتا ہے کہ ؏

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں

اِس "حدیثِ دلبری" میں مجھے جو لذت، مسرت اور بصیرت حاصل ہوتی ہے وہ مجھے اس سے بے نیاز بنا دیتی ہے کہ میں اپنی زبان وقلم کی بے مائگی اور عجز کو سوچوں، "ذکرِ دلبر" ہر حال میں خوشتر و پُرسحر

ہی ہونا ہے، لیکن یہ "حدیث دلبری" اقبال کی زبان میں "دلبری باقاہری" ہے جو حقیقتاً "پیغمبری" ہے اور یہ "حدیث اقبال" دراصل اُس اقبال کی کہانی ہے، جس کا کلام ایک زندہ پیام ہے اور وہ ایک ایسا "حدی خواں" ہے جو کاروانِ ملّت کو تیز گام رکھتا ہے۔

اقبال شاعر بھی تھا اور مفکر بھی، اس کی شاعری میں "انائی حکیم اور عصائے کلیم دونوں ہی پائے جاتے ہیں"، یہی وجہ ہے کہ حکمت و عظمت سے اقبال کا دامنِ شعر و ادب گہربار رہے۔ اقبال پیام برِ حیات ہے اور ناقدِ حیات بھی! وہ عروجِ آدم کا آرزومند ہے اور زوالِ آدم سے دردمند! اس کی شاعری میں جہاں گل و لالہ کی بہار ہے، وہاں زندگی کا خارزار بھی ہے۔ اُس کے کلام کو پڑھ کر گلوں کی خوشبو اور کانٹوں کی چبھن ہم دونوں ہی محسوس کرتے ہیں۔

اقبال شاعرِ حیات بھی ہے اور حیات کا رازداں اور اس کا پیغام بر بھی ہے، کسی شاعر کے کلام سے اس کے مکمل نظریۂ حیات کا جاننا مشکل ضرور ہے پر کچھ زیادہ دشوار نہیں اور اقبال جیسے عظیم شاعر کے کلام و پیام سے تو اس کا نظریۂ حیات روشن و عیاں ہے اس لئے کہ وہ اپنے نظریۂ حیات اور نظامِ زندگی کا صرف نغمہ خواں ہی نہیں پیغام بر بھی ہے

شعر گوئی اُس کے لئے صرف ایک ذریعہ اور وسیلہ ہے مقصد نہیں ، اقبال کے پیام اور نظریۂ زندگی کو سمجھنے کے لئے نہ مغرب کے فلسفوں کا جاننا ضروری ہے اور نہ کسی "ازم" کے جنون کی اور نہ بڑی ادبی نظر کی بلکہ یقین کی روشنی، دل کی حرارت اور قرآنی فکر و نظر درکار ہے۔ اس طرح ہم اس کے نظریۂ حیات و کائنات کا اندازہ بڑی آسانی سے کر سکتے ہیں۔

اقبال کی شاعری کا بیشتر حصہ یقین کی روشنی، محبت کی گرمی اور حرکت و عمل کا ایک ایسا پر کیف و رنگین نغمہ ہے جس کی نغمگی اور آتش نوائی سے حیات کے تار جھنجھنا اُٹھتے ہیں، اقبال کا سازِ حیات بے سوز نہیں ہے، بلکہ "عشق" نے اس میں حرارت اور "خودی" نے اس میں عظمت پیدا کر دی ہے اور اُسے جب شاعر کی انگلیاں چھیڑتی ہیں تو اس سے زندگی کے کیف آور نغمے پھوٹ پڑتے ہیں، جس سے ہمارے سرمایۂ مسرت و بصیرت میں اضافہ ہوتا ہے۔

اقبال کی شاعرانہ عظمت صرف یہ نہیں ہے کہ اُس نے ہمارے لئے ایسے مسرت آگیں شعر و نغمے پیش کئے جن کو سُن کر ہمارے شعور و وجدان کو اہتزاز و انبساط حاصل ہوتا ہے بلکہ اس نے ہمیں ایک نظریۂ حیات کا احساس، ایک نظامِ زندگی کا شعور اور زندگی کا ایک خاص نقطۂ نظر بخشا، جس نظریۂ زندگی کا وہ حامی اور جس نظامِ حیات کا وہ پیغام بر تھا

اُس پر اُس نے نہ صرف یہ کہ عمل کرنے کی ترغیب دی بلکہ اس کے کلام میں اُس مخصوص نظریۂ زندگی کا حسن، اُس کا رنگ و آہنگ، اور لذت و کیف اس طرح ہم آمیز اور رچا بسا ہوا ہے کہ آج بھی جب ہم اُسے پڑھتے ہیں تو ہمارے کانوں میں وہی رنگ و آہنگ وہی ساز کی جھنکار اور وہی شیریں نغمے گونجنے لگتے ہیں جس سے ہمیں مسرت، نشاط اور بصیرت حاصل ہوتی ہے۔

"حدیثِ اقبال" کے اِس مجموعے میں زندگی کے مختلف مسائل اور گوشے کی اقبال کے نقطۂ نظر سے وضاحت کی گئی ہے اور اقبال نے جو کچھ کہا ہے اُن کو ویسا ہی پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح اقبال کا حقیقی فکر اور اُس کا نظریہ اس کے کلام کی روشنی میں اُجاگر ہوکر سامنے آجاتا ہے۔ اس کتاب کا مدعا یہ ہے کہ اقبال جو کچھ اور جیسا کچھ بھی تھا اُس کی صحیح تصویر کلامِ اقبال کے آئینہ میں سامنے آجائے اور اپنے موئے قلم کے رنگ و روغن سے اس کی تصویر کے خد و خال کو نمایاں کرنے کی ناکام کوشش نہ کی جائے۔ اب تک "ادبیاتِ اقبال" کا جو قابلِ قدر سرمایہ ہمارے سامنے آیا ہے، اُن میں "روحِ اقبال" (از ڈاکٹر یوسف حسین) "اقبالِ کامل" (از عبدالسلام ندوی) اور اِن جیسی

ایک آدھ کتاب کے علاوہ باقی اکثر "ادبیاتِ اقبال" مصوّر کے موئے قلم کی خیالی تصویریں ہیں، حقیقت کم، پرچھائیں زیادہ! اُن کے علمی انداز اور ادبی وقار کا ہمیں انکار نہیں لیکن جو پہلو کہ قابلِ اعتراض ہے وہ ہے اقبال کے فکر کی اپنی توجیہیں اور تعبیریں، جو حقیقتاً اپنی "چشم غلط بیں" کا فساد ہے۔

اس کتاب میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ کالج کے طلبا اور ملت کے نوجوانوں کے سامنے اقبال کا کلام و پیام صحیح معنوں میں آجائے اور وہ اقبال کے "سوزِ جگر" اُس کے "عشق" اور اس کے "نور" اور "نظر" سے واقف ہو جائیں۔ اقبال کا پیام دراصل ملّت کے اُن "شاہیں بچوں" کے لئے ہے جن سے اقبال کی ساری امیدیں وابستہ تھیں اور جن کے "بال و پر" کے لئے اقبال نے دعائیں کی تھیں ؎

جوانوں کو مری آہِ سحر دے
تو ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے

"حدیثِ اقبال" کے اس مجموعے میں بعض مضامین تو وہ ہیں جو تازہ

اور نئے ہیں جیسے فکر اقبال ' اقبال کا نظریۂ شعر و ادب ، اقبال اور
عشقِ رسول " اور ان میں سے اکثر وہ ہیں جو ملک کے مختلف ادبی و علمی
رسائل میں شائع ہو چکے ہیں، جن پر اب نظرِ ثانی کی گئی ہے اور کچھ مضامین
ایسے بھی ہیں جو اگرچہ سنہ ۵۱ء اور سنہ ۵۲ء میں لکھے گئے تھے مثلاً "عورت اور
اقبال " تعلیم اور اقبال وغیرہ لیکن کتاب کے مسودہ کی تبیض کے وقت
ان پر نظرِ ثانی اور حذف و اضافہ کچھ اس انداز سے ہوا ہے کہ اب وہ گویا
نئے ہیں ۔ اس مجموعے میں دو اہم مضامین " اقبال کی شخصیت کے تخلیقی
عناصر " اور " انسانِ کامل اقبال کی نگاہ میں " استاذ مکرم مولانا سیّد
ابوالحسن علی ندوی (معتمد دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ) کے دو عربی مقالوں کا
اردو عکس ہے جو انہوں نے قاہرہ یونیورسٹی میں یوم اقبال کے موقع پر پڑھے تھے
اس سلسلہ میں ہم مولانا مکرم کے ممنون ہیں ۔

طیّب عثمانی

۱۲ر جون سنہ ۶۱ء

دارالکتاب ، سملہ ، گیا

فکرِ اقبال

اقبال کی شخصیت چمنستان ادب میں ایک ایسے گلِ سرسبد کی تھی، جس کی گل بیزیوں، دل آویزیوں اور روح افزا نکہتوں سے سارا چمن ادب معطر تھا، اُس کے کلام کی پاکیزگی، دلکشی اور دل آویزی سے ہوش و خرد اور قلب و نظر دونوں ہی شکار ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ جہاں کلام اقبال نے گیسوئے اردو کو تابدار کیا، وہیں فکرِ اقبال نے دل و نگاہ میں مزید تابانی بخشی۔

اردو شاعری کے افق پر یوں تو سینکڑوں روشن ستارے نمودار ہوئے جن کے رنگ و نور نے دنیائے شاعری میں قوس قزح کی رنگینی اور دل آفرینی پیدا کی، جس کی روشنی اور جگمگاہٹ آج بھی افق ادب پر نمایاں ہے میرؔ، دردؔ، مومنؔ اور غالبؔ نے اردو شاعری کا جو چراغ جلایا تھا اس کی لویں ابھی مدھم نہیں ہوئی ہیں، اس میں روشنی، گرمی اور حرارت اب بھی باقی ہے، لیکن اِن سب کے بعد اقبال کا جو "نیرِ تاباں" طلوع ہوا اور اس کی کرنیں جب افق شاعری پر پڑیں تو اس کی جگمگاہٹ سے

پوری اردو شاعری شفق کا گلزار بن گئی اور رنگ و نور سے معمور ہو گئی، اس میں فن کا رچاؤ اور مقصد کا سنہراؤ اس طرح ہم آمیز تھا کہ اس نے فکر و فن کا ایک نیا معیار اردو شاعری کو عطا کیا، جس میں فکر و فن کی روشنی و تابانی اور ایمان و ایقان کی حرارت اور جگمگاہٹ دونوں ہی موجود تھی۔

اقبال کا فکر ایک ایسا بحر بیکراں ہے، جس میں زندگی کے مختلف دھارے آکر ملتے ہیں۔ کلام اقبال کے تفصیلی مطالعہ سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کا مطالعہ وسیع اور علم عمیق ہے۔ اُن کے علم و مطالعہ کے بے پایاں ہونے ہی کا یہ اثر ہے کہ فکر بلند کے ساتھ ساتھ وہ صحت فکر بھی رکھتے ہیں۔ اُن کا تخیل بلند پرواز اور ان کی نظر دوربیں ہے۔ اقبال کی فکری وسعت اور ہمہ گیری کی مثال ایک ایسے جھیل کی سی ہے، جس کے اتھاہ پانی میں نیلگوں آسمان کی بلندی کا عکس اور سمندر کی گہرائی ہو جس میں صاف شفاف چشمے کی سی پاکیزگی اور اس کا حُسن ہو۔ یہی وجہ تھی کہ اقبال اپنے ہم عصروں میں اُس "مہر نیم روز" کے مانند بلند ہوئے کہ جس کے نمایاں ہوتے ہی اردو شاعری کے سینکڑوں روشن ستارے ماند پڑ گئے۔

اقبال نے حیات و کائنات کا بڑا عمیق مطالعہ کیا تھا اور زندگی کے تمام مسائل کو صرف ایک شاعر، ایک فلسفی کی حیثیت سے نہیں

بلکہ ایک مردِ مومن کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ اقبال کا فکری تفلسف اور طبعی رجحان شاعری ہمیشہ ثانوی حیثیت رکھتے تھے۔ اُن کے فلسفہ اور شاعری کا اصلی سرچشمہ اُن کا قلبِ مومن تھا، جس سے زندگی کے سوتے فلسفہ کی زبان، شاعری کے روپ میں پھوٹتے تھے۔ اقبال کے سطح بین ناقدین اور مداحین نے ہمیشہ اقبال کی شاعری کے ظاہری خول اور اور فلسفیانہ زبان کی لفظی اصطلاحات کو دیکھا اور اُس کی اپنی تشریحات و توجیہات کرتے رہے، جو فکرِ اقبال نہ تھا بلکہ وہ ساری تشریحات دراصل "در فکرِ خود" کے مصداق تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ کلامِ اقبال سے فکرِ اقبال کی نت نئی تشریحیں اور تعبیریں تو سامنے آئیں اور جس نے بہت حد تک اردو ادب میں ایک اچھا خاصہ "ادبیاتِ اقبال" کا اضافہ کر دیا مگر حقیقت یہ ہے کہ فکرِ اقبال کی اِن خود ساختہ توجیہوں اور کثرتِ تعبیر نے اُن کے فکر کو "افکارِ پریشاں" بنا دیا اور ادبیاتِ اقبال ایک ایسا "عجوبۂ روزگار" بن کر رہ گیا جسے صرف مختلف اور متضاد افکار کا مجموعہ کہا جا سکتا ہے اور بس!

شارحینِ اقبال کا یہ ذہنی تضاد اور فکری انتشار ہی تھا جس سے کلامِ اقبال میں بھی بعض "سخن فہموں" کو تضاد نظر آنے لگا اور اس کی نت نئی تعبیریں سامنے آئیں۔ حالانکہ کلامِ اقبال میں تضاد نہیں، بلکہ

حقیقتاً "ارتقا" ہے اور اس فکری ارتقا کو تضاد سے تعبیر کرنا سخن شناسی ہی نہیں، بے بصری بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کے بعض ناقدین نے اُسے "فسطائیت" کا علمبردار قرار دیا اور اُنہیں اقبال کے "شاہین" میں ہٹلر و مسولینی جیسے بے خدا ڈکٹیٹر کی شکل نظر آئی اور اس تصویر تمثیل میں فقر اسلامی کی جو روح اقبال نے دیکھی تھی وہ اِن کم نظروں کو دکھائی نہ دی۔ حالانکہ کلام اقبال کے علاوہ تصور شاہین کی حقیقت کو اقبال نے اپنے ایک خط میں بہت صاف لفظوں میں اس طرح بیان کیا ہے۔

"شاہین کی تشبیہہ محض شاعرانہ تشبیہہ نہیں ہے اس جانور میں اسلامی فقر کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں (۱) خوددار اور غیرت مند ہے کہ اوروں کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا (۲) بے تعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا (۳) بلند پرواز ہے (۴) خلوت نشیں ہے (۵) تیز نگاہ ہے۔"

فسطائیت اور دوسرے تمام ازموں کی تردید کے لئے اقبال ہی کا دوسرا خط بھی ہے جو اس سلسلہ میں حرف آخر ہے۔

"میرے سامنے فاشزم اور کمیونزم یا زمانہ حال کے اور "ازم" کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ میرے عقاید کی رو سے صرف اسلام ہی ایک حقیقت ہے جو بنی نوع انسان کے لئے

ہر نقطۂ نگاہ سے موجب نجات ہو سکتی ہے ۔۔۔۔۔'

اقبال کے بعض دوسرے مداحین کے نزدیک اس عظیم شاعر کی
ساری شعری تخلیقات میں صرف مارکس کا "جدلیاتی عمل" (DIALECTI-
CAL PROCESS) اور طبقاتی کشمکش نظر آیا۔ اقبال کا یہ شعر ؎

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو

اُن کے فکر کا عنوان بن گیا اور اقبال ایک ترقی پسند اشتراکی شاعر
قرار دیدئیے گئے، اسی کو کہتے ہیں ؎

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے

حالانکہ متذکرہ بالا خطوط کے اقتباس کے علاوہ پورا کلام اقبال اِس
"عظیم جھوٹ" کی تردید کے لئے کافی ہے۔

اقبال کے بعض شارحین وہ بھی ہیں جنہوں نے افکار اقبال کو
یورپ کے فلاسفہ کے نظریات کی عینک سے دیکھا اور انہیں اقبال کے
فلسفہ میں نطشے، گوئٹے، برگساں اور ہیگل کے نظریات کا عکس
نظر آیا اور انہوں نے اقبال کے فکر کی فلسفیانہ توجیہیں یورپ کے
متشککین، بے یقین فلسفیوں کے روزانہ کے بدلتے ہوئے نظریات کے

آئینہ میں کیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کلام اقبال سے یورپ کے فلسفیوں کی طرح ایک نیا "فلسفۂ اقبال" تو ضرور وجود میں آگیا، لیکن "حقیقتِ اقبال" نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

ہاں "ادبیات اقبال" میں بعض ایسی کتابیں بھی ضرور ہیں، جو صحیح معنوں میں فکر اقبال کی ترجمان کہی جا سکتی ہیں اور ان میں ڈاکٹر یوسف حسین کی "روح اقبال" فکر اقبال کی سب سے بہتر ترجمانی کہی جا سکتی ہے لیکن "ادبیات اقبال" کے اس "عجوبۂ روزگار" مجموعۂ افکار سے فکر اقبال کے حقیقی گہر ہائے آبدار چننا افکار کے بحر بیکراں سے سچے موتیوں کو تلاش کرنا ہے۔ جو ہر کس و ناکس کا کام نہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ اقبال کی شخصیت اور اس کے فکری پس منظر کا جائزہ لیا جائے اور کلام اقبال سے حقیقی فکر اقبال کا کھوج لگایا جائے۔

اقبال کا فکر ایک ایسی روشن شاہراہ ہے، جس پر زندگی کے قافلے گذرے ہیں اور یہ وہ شاہراہ حیات ہے جس پر اقبال کے "مردمومن" کے قدموں کے نشانات آج بھی ابھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جس میں روشنی ہے، چمک ہے اور جگمگاہٹ ہے۔ اقبال نے یہ کبھی نہیں کہا کہ اُن کا فکر کوئی نیا فکر ہے، اُن کا فلسفہ کوئی نیا فلسفہ ہے، اُنہوں نے زندگی کے لئے کسی نئے راستے کا انکشاف کیا ہے بلکہ اُن کا کلام اس بات کی

شہادت ہے کہ حقیقی زندگی وہی ہے جو "فیضانِ سماوی" سے بہرہ اندوز ہو اور یہ وہی زندگی ہے جو ایک قادرِ مطلق علیم و خبیر، دانا و بینا، خالق و مالکِ ہستی کی بنائی ہوئی زندگی ہے جو اسلام کا ضابطۂ حیات ہے۔

اقبال کا فکری محور دراصل اسلام ہی ہے ——— اسلام ان کی رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا ؎

شوق میری لَے میں ہے شوق میری نَے میں ہے
نغمۂ اللہ ھو میرے رگ و پے میں ہے

اقبال کی یہ خواہش تھی کہ اُن کا یہ نورِ بصیرت ملت کے جوانوں میں عام ہو جائے اور امتدادِ زمانہ سے اُن کے دلوں میں اسلام کی دبی ہوئی چنگاری جو بجھ رہی ہے اِن کی نوائے آتشیں سے پھر شعلہ جوالہ بن جائے۔ اِس مقصد کے حصول کے لئے اُنھوں نے وہ اندازِ بیان اور پیرایۂ اظہار اختیار کیا، جس میں دل کا سوز، تلوار کی تیزی، پھولوں کا حسن اور ساز کی جھنکار سب کچھ پوشیدہ ہے اور جس نے بلاشبہ جوانوں کی ایک ایسی نسل ضرور پیدا کر دی جو اس کے آتشیں کلام سے اپنے فکر کو روشن اور اپنے نہاں خانۂ دل کو شعلہ تپاں رکھتی ہے۔

اقبال کی شاعری "جزو پیغمبری" ہے اور اس کا کلام دراصل فکرِ قرآنی کا عکاس ہے۔ اقبال نے حیات و کائنات کے مطالعہ و مشاہدہ میں

ہمیشہ قرآن کے نقطۂ نظر کو سامنے رکھا، اقبال کی ساری فکر انگیزی قرآن کے چشمۂ صافی کی مرہونِ منت ہے اور نہ صرف یہ کہ اقبال نے مشاہدۂ حیات میں صرف قرآن کی اُن ابدی صداقتوں اور بنیادی قدروں کو سامنے رکھا جو ہمیشہ سے انسانیت کی تعمیر و تہذیب کرتی آئی ہیں بلکہ اقبال کا ادب و فن بھی قرآنی فن و ادب کا خوشہ چیں ہے۔ ہمیں جہاں اقبال کے کلام میں درد، سوز، حرارت اور تپش نظر آتی ہے وہیں فکر کی روشنی، منطقی استدلال، فلسفیانہ انداز اور عقل و خرد کے چراغ جلتے نظر آتے ہیں، قرآن کا ادبی اسلوب بھی یہی ہے۔ وہ ایک طرف مشاہدہ کائنات کی دعوت دیتا ہے اور ساتھ ہی معتدل جذبات نگاری کرتا ہے، تو دوسری طرف غور و فکر اور تفکر و تدبر کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ قرآنی ادب میں فکر و دانش اور جذبات نگاری کی ایک حسین آمیزش ہے۔

اگر بنظرِ عمیق کلامِ اقبال کا مطالعہ کیا جائے تو اقبال کی تمام تر شاعری نورِ قرآنی سے منور اور اس کی خوشبو سے معطر نظر آئے گی۔ اس لئے کہ اقبال کی زندگی پر سب سے زیادہ جس کتاب نے اثر ڈالا ہے۔ وہ عظیم الہامی کتاب "قرآن" ہی ہے، جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں ؎

داستانِ کہنہ شستی باب باب — فکر را روشن کن از اُم الکتاب
جز بقرآں ضیغمی روباہی است — فقر قرآں اصل شاہنشاہی است
نقش قرآں تا دریں عالم نشست — نقشہائے کاہن و پاپا شکست

اقبال کہتے ہیں کہ داستانِ پارینہ کا اب زمانہ نہیں رہا، اسے اب ختم کرو اور اپنے فکر کو ام الکتاب قرآن مجید سے روشن کرو۔ اس لئے کہ قرآن سے ہٹ کر صرف روباہی و بزدلی ہی باقی رہتی ہے۔ اور اس کائنات میں جہانبانی و سلطانی فقرِ قرانی ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ جب قرآن کا نقش دوام عالم پر چھا جاتا ہے تو تمام عارضی و فانی نقوش اس کائنات پر سے حرف غلط کی طرح مٹ جاتے ہیں۔

پھر آخر میں حضرت اقبال فرماتے ہیں کہ میں تم پر اپنے دل کا فاش کرتا ہوں کہ قرآن کوئی "معمولی کتاب" نہیں ہے، بلکہ ایک "چیزے دیگر" ہے، اک "نسخۂ کیمیا" ہے۔ ایک ایسا "شاہ کلید" ہے کہ اسے زندگی کے جس شعبہ پر لگائیے فوراً کھل جائے گا ؎

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتاب نیست چیزے دیگر است

فکر اقبال جہاں نور قرآں سے روشن تھا وہیں اس کا قلب عشقِ رسول کے سوز میں شعلہ نیاں تھا، اقبال کے افکار کی بالیدگی اور

توانائی میں روح قرآن کا جس قدر حصہ ہے اسی قدر عشق رسول کی آنچ نے اُس میں روشنی، گرمی اور جلا بخش دی ہے۔ یہ حبِ رسول ہی کا فیض تھا جس نے اس کی حیات کو پرسوز و تابناک اور آتشناک بنا دیا تھا اقبال کے کلام میں عشق کی سوزش اس کی سرمستی و سرخوشی سوز و ساز اور درد و داغ جو پایا جاتا ہے وہ دراصل عشق رسول ہی کا نتیجہ ہے۔ اقبال کے جہان شاعری میں نور مصطفےؐ ہی سے بہار ہے اور عشق مصطفےؐ ہی نے اس کے چمنِ شاعری میں گلہائے رنگ رنگ پیدا کر دیا ہے۔ اقبال کا عشق سرمایہ زندگی ہے' زندگی کی ساری توانائیاں عشق ہی کی مرہون منت ہیں اور یہ توانائیاں عشق ہی سے زندہ پائندہ اور تابندہ ہیں۔ اقبال کا عشق ایک ایسا مضراب ہے جس سے زندگی کے تار جھنجھنا اُٹھتے ہیں اور پھر اس سے نغمۂ حیات پھوٹ پڑتے ہیں' اس کا عشق نورِ حیات بھی اور نارِ حیات بھی! اور جس مرد مومن کی زندگی نار و نور سے معمور ہو اس کی رنگیں نوائی اور آتش بیانی کا کیا پوچھنا؟ اسی چیز نے اقبال کے کلام میں جادو بھر دیا ہے' جس سے آج سارا عالم ادب مسحور ہے۔

یہ شاعر رنگیں نوا جو اپنے اندر آتش نوائی' بھی رکھتا اور رنگین بیانی بھی! اور اس کی اس شعلہ نوائی' کا سرچشمہ خود اس کا قلب ہے جو ایک

مردِ مومن کا قلب ہے، ایسے مردِ مومن کا جس کے دنوں کی تپش اور شبوں کے گداز سے اس کائنات میں زندگی کے آثار پائے جاتے ہیں اور اس کے سرور و شوق سے زندگی کے نغمے گونجتے ہیں۔ اقبال کا یہ مردِ مومن "حاملِ خلقِ عظیم" اور "صاحبِ صدق و یقین" ہے، جس کی نگاہوں نے مشرق و مغرب کی تربیت کی۔ اور جس نے یورپ کے ظلمت کدوں میں فکر و نظر اور عقل و خرد کے روشن چراغ جلائے، جو خوش دل گرم جوش، سادہ و روشن جبیں ہے اور ؏

جس کی نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دلنشیں

اقبال کے قلب میں ایک مومن کا گداز، عشق کی سوزش اور یقین کی روشنی ہے، جس سے زندگی کے آبشار گرتے ہیں، محبت کے نغمے ابلتے ہیں اور اس کی مترنم آواز دلوں کو گرماتی، انسانیت کے خوابیدہ جذبات کو چھیڑتی اور اُن میں روح و زندگی پیدا کرتی ہے۔

اقبال کی شاعری صرف الفاظ کی تراش و خراش، نوک اور پلک اور موزوں الفاظ کا نام نہیں ہے بلکہ اُن کی شاعری انسانی جذبات و احساسات اور تجربات کا نام ہے۔ برسہا برس کے مشاہدات و تجربات کے بعد اُن کے اپنے جذبات و احساسات نے موزوں الفاظ خوبصورت تشبیہات اور دلنشیں استعارات کے روپ دھارے ہیں۔

پھر اس سے دلکش و پرسوز نغمے جاری ہوئے ہیں۔

اقبال کا مطالعہ وسیع اور علم بے پایاں تھا، وہ علوم جدید و قدیم کے سنگم تھے، مشرق و مغرب کے افکار و خیالات پر انہیں بڑی دسترس حاصل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے کلام نے جہاں روح مشرق کو گرمایا وہاں ذہن مغرب میں ایک ہلچل ڈال دی اُنہوں نے جو کچھ کہا وہ کوئی نئی بات تو نہ تھی ہاں کہنے کا انداز ضرور نیا تھا، انداز بیان میں یقیناً جدت تھی۔ اردو شاعری میں انہوں نے نہ صرف یہ کہ فکر انگیزی بخشی بلکہ اردو شاعری کو انہوں نے ایک نیا اسلوب ایک نئی ہیئت اور ایک نیا رنگ اور روپ عطا کیا، اُن کی نئی نئی تشبیہوں، تلمیحوں، استعاروں اور ترکیبوں نے اردو شاعری کے فن میں بڑا اضافہ کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال کی نادر تشبیہات اور جدید ترکیبوں نے اُن کے کلام کو باغ و بہار بنا دیا، جس سے کلام اقبال کی اثر انگیزی دوچند ہو گئی، اقبال کا یہ فن اور آرٹ دراصل اقبال کے اُسی فکر روشن اور قلب سوزاں کا مرہون منت ہے۔

فکر اقبال کو سمجھنے کے لئے اقبال کے اِن تمام فکری پس منظر اور اُس کی شخصیت کی تخلیق میں جن عناصر نے حصہ لیا ہے، اُن کا سمجھنا ناگزیر ہے، جن کی طرف ہم نے ابھی صرف چند اشارے کئے ہیں،

ورنہ حقیقت یہ ہے کہ کلامِ اقبال کے مجموعوں میں فکرِ اقبال کے روشن چراغ جلتے نظر آتے ہیں اور جب ہم اُنہیں پڑھتے ہیں تو اس سے ہم اپنے فکر میں روشنی، قلب میں گرمی، اور زندگی میں حرکت محسوس کرتے ہیں، یہی روشنی، گرمی اور حرکت کلامِ اقبال کی خوبی بھی ہے اور فکرِ اقبال کا مقصد بھی ——— !!

اقبالؔ کی شخصیت کے تخلیقی عناصر

اقبال کی شخصیت کے وہ تخلیقی عناصر جس نے اقبال میں ایک مخصوص قسم کی گوناگونی، رنگارنگی پیدا کردی، اور جس نے اقبال کو اس کے ہم عصروں سے زیادہ دل آویز، باعث کشش اور جاذب نظر بنادیا، چند ایسے عناصر ہیں جن کا تعلق اقبال کی علمی وادبی اور تعلیمی کوششوں سے بہت ہی کم ہے۔ اقبال کی شخصیت میں جو جامعیت بلندی فکروخیال، سوز، درد، کشش اور جاذبیت نظر آتی ہے، ان کا تعلق اقبال کی زندگی کے اس رخ سے ہے، جسے ہم یقین وایمان کہتے ہیں۔

دراصل اقبال کی شخصیت کے بنانے، سنوارنے اور پروان چڑھانے میں عصر حاضر کے صرف ان تعلیمی اداروں اور یونیورسٹیوں کا ہاتھ نہیں ہے، جن میں کہ اقبال نے داخل ہوکر علوم عصریہ اور مغربی تعلیم حاصل کی۔ گرچہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اقبال علوم جدیدہ اور مغربی تعلیم کا حصول ہندوستان، انگلستان، اور جرمنی کے ماہر اساتذہ سے

کرتے رہے، اور وہاں کے علم وفن کے چشموں سے سیراب ہوتے رہے، یہانتک کہ وہ عالم اسلامی میں مغربی علوم وافکار اور تہذیب وتمدن کے ماہرین میں منفرد شخصیت کے مالک ہوگئے، مغربی فلسفہ واجتماع، اخلاق اور سیاست ومعیشت میں یورپ کے ایک متخصص کی حیثیت حاصل کی، اور علوم جدید وقدیم میں بڑی گہری نگاہ حاصل کی، لیکن اگر اقبال اس مقام پر پہنچ کر ٹھہر جاتے اور موجودہ تعلیمی اداروں کے پھلوں سے استفادہ کے بعد مطمئن ہوکر صرف اُس حلاوت ومزہ سے لطف اندوز ہوتے رہتے تو پھر آج وہ ہمارے موضوع گفتگو نہیں بن سکتے تھے، اور نہ ادب اسلامی اور تاریخ ادب اسلامی ان کے شعر وادب کے نغموں سے گونجتی رہتیں، اور نہ علمی صدارت، فکری زعامت اور اسلامی ذہانت ان کے لئے اپنا دامن وسیع کرتیں، اور نہ انہیں اس بلند مقام پر بٹھا کر فخر محسوس کرتیں، اس کے لئے بڑی باریک اور بلند شرطیں ہیں، کوئی شخص محض درس وتدریس علوم میں تنوع اور کثرت تالیف وتصنیف کی وجہ سے اس مقام بلند تک نہیں پہنچ سکتا، بلکہ اقبال اگر ان تعلیمی اداروں سے استفادہ کے بعد مطمئن ہوجاتے اور انہیں علوم وفنون کی علمی موشگافیوں میں اپنی دلچسپیوں کو محدود رکھتے تو زیادہ سے زیادہ فلسفہ، معاشیا ادب اور تاریخ میں ایک ماہر استاذ اور پروفیسر کی جگہ اختیار کرتے، یا ایک بڑے پایہ کے مصنف، علوم عصریہ کے ماہر فن، صاحب اسلوب، ادیب یا ایک اچھے شاعر ہوتے، ادیب! یا پھر ایک کامیاب بیرسٹر ایک اچھے جج یا حکومت کے

ایک اچھے وزیر بنائے جاتے، لیکن آپ یقین کیجئے اگر اقبال ان میں سے کچھ بھی ہوتے تو زمانہ انہیں ویسے ہی بھلا دیتا جس طرح دنیا کے ان بڑے بڑے علماء ادباء شعراء مصنفین اور حکومتوں کے وزراء کو آج زمانے نے گوشۂ عزلت و گمنامی میں ڈال رکھا ہے، اور آج کوئی نہیں جانتا کہ وہ کون تھے؟ اور کیا تھے؟ لیکن اقبال کی ذہانت و عبقریت، ان کا زندۂ جاوید پیغام، اور ان کی ذہنوں اور دلوں کی تسخیر کرنے کی طاقت و کشش ـــــ ان تمام فضائل اور بلندیوں کا سبب ان دنیاوی تعلیمی اداروں سے جدا، ایک دوسرا تعلیمی ادارہ ہے جس میں کہ اقبال نے تعلیم و تربیت حاصل کی، بڑھے اور پروان چڑھے۔

میرا خیال ہے کہ آپ میں اکثر کا ذہن اس مخصوص "ادارہ" کی تلاش و جستجو میں پریشان ہوگا، اور آپ اس کے جاننے کیلئے بے چین ہوں گے کہ آخر وہ کون سا ادارہ ہے جس نے اس عظیم شاعر کو پیدا کیا؟ اور وہ کون سے علوم ہیں جو اس میں پڑھائے جاتے ہیں؟ کس زبان میں وہاں تعلیم ہوتی ہے؟ اور کیسے معلم وہاں تعلیم دیتے ہیں؟ بلاشبہ اس میں اعلیٰ درجے کے نگراں اور مربی ہیں جو ایسی ہی عظیم شخصیتیں پیدا کرتے ہیں (جیسے اقبال تھے) مجھے یقین ہے کہ اگر آپ اس کے وجود اور محل و مقام سے واقف ہو جائیں تو پھر ضرور اس میں داخلہ کی کوشش کریں گے اور اپنی تعلیم و تربیت کے لئے اپنے آپ کو اس بےنظیر و بے مثال ادارہ کے سپرد کر دیں گے۔

وہ ایک ایسا ادارہ ہے جس نے اس میں تعلیم و تربیت حاصل کی، اسکی ناکامی کا کوئی سوال نہیں، جو وہاں سے نکلا وہ ضائع نہیں ہو سکتا، وہ ایک ایسا ادارہ ہے کہ جہاں سے صرف ائمہ فن، مجتہدین فکر، واضعین علوم، قائدین فکر واصلاح، مجددین امت ہی پیدا ہوتے ہیں، وہ جو کچھ لکھنے میں اس کے سمجھنے میں عام مدارس و یونیورسٹیوں کے طلبا و اساتذہ مشغول رہتے ہیں، ان کی لکھی ہوئی چیزیں درس کے طور پر پڑھائی جاتی ہیں، ان کی تصنیفوں کی شرحیں لکھی جاتی ہیں، ان کے اجمال کی تفصیل کی جاتی ہے، ان کے ثابت شدہ نظریات کی تائید و تشریح ہوتی ہے، ان کے ایک ایک لفظ پر کتابیں لکھی جاتی ہیں، اور ان کی ایک ایک کتاب سے پورا پورا مکتبہ تیار ہو جاتا ہے۔ وہ ایک ایسا ادارہ ہے جہاں تاریخ پڑھائی نہیں جاتی بلکہ تاریخ کی تخلیق ہوتی ہے وہاں افکار و نظریات کی تشریح و توضیح نہیں ہوتی بلکہ افکار و نظریات وضع کئے جاتے ہیں، آثار و نشانات کے کھوج نہیں لگائے جاتے بلکہ وہاں سے آثار و نشانات پیدا ہوتے ہیں، یہ ادارہ اور مدرسہ ہر جگہ اور ہر زمانے میں پایا جاتا ہے۔ یہ دراصل ایک داخلی مدرسہ ہے جو ہر انسان کے ساتھ پیدا ہوتا ہے اور ہر انسان اسے اٹھائے اور ہر مقام پر لئے پھرتا ہے وہ دل کا مدرسہ اور ضمیر و وجدان کا ادارہ ہے، وہ ایک ایسا مدرسہ ہے جہاں روحانی قوت اور الٰہی تربیت ہوتی ہے۔

اقبال نے اس ادارہ سے اُسی طرح تکمیل کی جس طرح دوسرے
بہت سے وہی انسان اس عظیم ادارہ سے تعلیم و تربیت کے بعد نکلے۔ اقبال کی
سیرت و شخصیت، اس کا علم و فضل اور اخلاق، یہ سب کا سب مرہون منت ہے
اُسی قلبی ادارہ کا جس میں کہ اقبال نے برسوں بادیہ پیمائی کی ہے۔ اقبال کے
کلام کا مطالعہ اس حقیقت کی اچھی نشاندہی کرتا ہے کہ خارجی مدرسہ کی بہ نسبت
داخلی مدرسہ نے اس کی زندگی میں ایک درد و سوز، تب و تاب' اور ایک
نئی قوت و توانائی بخشی۔ اگر وہ اپنے داخلی مدرسہ میں تعلیم و تربیت حاصل
نہیں کرتا تو پھر نہ اسکی یہ جاذب نظر شخصیت ہی ظاہر ہوتی، اور نہ اسکا شعور
و وجدان اس قدر شعلہ نیاں نظر آتا' اور نہ اس کا آتشیں پیام قلب و نظر
کیلئے سوز جاوداں ثابت ہوتا' اقبال کے کلام میں اس ادارہ کے اساتذہ
و معلمین اور مربین کا ذکر اور فضل بہت ہی کثرت سے ملتا ہے۔

وہ تخلیقی عناصر جس نے اقبال کی شخصیت کو بنایا، بڑھایا اور
پروان چڑھایا وہ دراصل اقبال کو اپنے داخلی مدرسہ میں حاصل ہوئے
یہ پانچ تخلیقی عناصر ہیں جنہوں نے اقبال کی شخصیت کو "زندۂ جاوید" بنادیا
ان میں سے پہلا عنصر جو اقبال کو اپنے داخلی مدرسہ میں داخلے
بعد اول ہی دن حاصل ہوا وہ اس کا "ایمان و یقین" ہے۔ یہی یقین
اقبال کا سب سے پہلا مربی اور مرشد ہے اور یہی اسکی طاقت و قوت اور حکمت و

فراست کا منبع اور سرچشمہ ہے۔ لیکن اقبال کا وہ یقین و ایمان اس خشک جامد ایمان کی طرح نہیں جو بے جان تصدیق یا محض جامد عقیدہ ہے۔ بلکہ اقبال کا "یقین" عقیدہ و محبت کا ایک ایسا حسین امتزاج ہے جو اس کے قلب و وجدان، اس کی عقل و فکر، اس کے ارادے و تصرف، اس کی دوستی و دشمنی، غرض کہ اس کی ساری زندگی پر چھایا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال اسلام اور اس کے پیغام کے بارے میں نہایت شدید الایمان تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کی محبت شغف اور ان کا اخلاص انتہا درجہ کا تھا۔ اس لئے کہ ان کے نزدیک اسلام ہی ایک ایسا زندۂ جاوید دین ہے کہ اس کے بغیر انسانیت فلاح و سعادت کے بام عروج تک پہنچ ہی نہیں سکتی۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم رشد و ہدایت کے آخری مینار، نبوت و رسالت کے خاتم اور مولائے کل ہیں ؎

وہ دانائے سُبل، ختم الرسل، مولائے کل جس نے
غبار راہ کو بخشا، فروغ وادیٔ سینا

اس دور مادیت اور مغربی تہذیب و تمدن کی ظاہری چمک دمک سے اقبال کی آنکھیں خیرہ نہ ہو سکیں، حالانکہ اقبال نے جلوۂ دانشِ فرنگ میں زندگی کے ایک طویل ایام گذارے۔ اسکی وجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اقبال کی وہی والہانہ محبت ،

جذبۂ عشق اور روحانی اتصال تھا، اور بلاشبہ ایک حبِ صادق اور
عشقِ حقیقی ہی قلب و نظر کیلئے ایک اچھا محافظ اور مشعلِ راہ بن سکتا ہے

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

عذابِ دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیل

رہے ہیں اُدہیں فرعون میری گھات میں اب تک مگر کیا غم کہ میری آستیں میں ہے یدِ بیضا

عجب کیا گر مہ و پرویں مرے نخچیر ہو جائیں کہ بر فتراک صاحب دولتے بستم سرِ خود را

علامہ اقبال نے اپنی کتاب " اسرارِ خودی " میں ملت اسلامیہ کی زندگی کی بنیادوں، اور ان ستونوں کے ذکر کے سلسلہ میں، جس پر حیاتِ ملت اسلامیہ موقوف ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنے روحانی تعلق دائمی اتصال اور اپنی فداکارانہ محبت کا بھی ذکر کیا ہے۔ جب وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ کرتے ہیں تو ان کا شعری وجدان جوش مارنے لگتا ہے اور مدحیہ اشعار ابلنے لگتے ہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے محبت و عقیدت کے چشمے پھوٹ پڑے ہوں۔ اس سلسلہ میں چند اشعار پیش خدمت ہیں جن سے اقبال کے محبت بھرے جذبات کا قدرے اندازہ ہوگا۔ ؎

در دل مسلم مقام مصطفےٰ است　　آبروئے ما ز نام مصطفےٰ است

بوریا ممنون خواب راحتش　　تاج کسریٰ زیر پائے امتش

در شبستان حرا خلوت گزید　　قوم و آئین و حکومت آفرید

ماند شبہا چشم او محروم نوم　　تا بہ تخت خسروی خوابیدہ قوم

وقت ہیجا تیغ او آہن گداز　　دیدۂ او اشکبار اندر نماز

در دعائے نصرت آمین تیغ او　　قاطع نسل سلاطین تیغ او

در جہاں آئین نو آغاز کرد　　مسند اقوام پیشیں در نورد

از کلید دیں در دنیا کشاد　　ہمچو او بطن اُم گیتی نزاد

در نگاہ او یکے بالا و پست　　با غلام خویش بر یک خواں نشست

در مصافے پیش آں گردوں سریر　　دختر سردار طےؔ آمد اسیر

پائے در زنجیر و ہم بے پردہ بود　　گردن از شرم و حیا خم کردہ بود

دخترک را چوں نبیؐ بے پردہ دید　　چادر خود پیش روئے او کشید

آں کہ بر اعدا در رحمت کشاد　　مکہ را پیغام لا تثریب داد

ما کہ از قید وطن بیگانہ ایم　　چوں نگہ نور دو چشمیم و یکیم

از حجاز و چین و ایرانیم ما　　شبنم یک صبح خندانیم ما

مست چشم ساقی بطحاستیم　　در جہاں مثل مے و میناستیم

امتیازات نسب را پاک سوخت　　آتش او ایں خس و خاشاک سوخت

شورِ عشقش در نئے خاموش من　　می تپد صد نغمہ در آغوش من

من چہ گویم از تولّائش کہ چیست　　خشک چوبے در فراق او گریست

ہستی مسلم تجلّی گاہ او　　طور ہا بالد زگرد راہ او

جوں جوں زندگی کے دن گذرتے گئے، اقبال کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ والہانہ محبت والفت بڑھتی ہی گئی، یہاں تک کہ آخری عمر میں جب بھی ان کی مجلس میں نبی صلے اللہ علیہ وسلم کا ذکر آتا یا مدینہ منورہ کا تذکرہ ہوتا تو اقبال بے قرار ہو جاتے، آنکھیں بھر آتیں، یہاں تک کہ آنسو رواں ہو جاتے۔ یہی وہ گہری محبت تھی جو ان کی زبان سے الہامی شعروں کو جاری کر دیتی تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں ؎

حساب من زچشم او نہاں گیر　　مکن رسوا حضور خواجہ مارا

محبت وعقیدت کا یہ "شعر" کتنا اچھا مظہر ہے۔

دراصل علامہ اقبال کا یہی وہ ایمانِ کامل اور حُبّ صادق تھا جس نے اقبال کے کلام میں یہ جوش، یہ ولولہ، یہ سوز وگداز پیدا کر دیا اگر آپ تاریخ کا مطالعہ کریں گے تو یہ حقیقت عیاں ہو جائے گی کہ دراصل رقیق شعر، عمیق فکر، روشن حکمت، بلند معنویت، نمایاں شجاعت نادر شخصیت اور عبقریت کا حقیقی منبع وسرچشمہ محبت ویقین ہی ہے اور تاریخ عالم میں جو کچھ بھی انسانی کمالات یا دائمی آثار نظر آتے ہیں وہ سب کے سب

اسی محبت و یقین کے مرہونِ منت ہیں ______

اگر کوئی شخصیت محبت و یقین کے جذبہ سے خالی ہو تو پھر وہ صرف گوشت و پوست کی صورت ہے، اور اگر پوری اُمّت اس سے خالی ہے تو پھر اسکی وقعت بکریوں اور بھیڑیوں کے گلے سے زیادہ نہیں۔ اور اسی طرح اگر کسی کلام میں یقین و محبت کی روح کارفرما نہیں ہے تو پھر وہ ایک مقفّیٰ اور موزوں کلام تو ہو سکتا ہے لیکن ایک زندہ جاوید کلام نہیں بن سکتا، اور جب کوئی کتاب اس روح سے خالی ہو تو اس کتاب کی حیثیت مجموعۂ اوراق سے زیادہ نہیں ہوگی۔ اور اسی طرح اگر کسی عبادت میں محبت و یقین کا جذبہ شامل نہیں تو پھر ایسی عبادت بیکار ہے۔ اور وہ ایک بے روح ڈھانچہ ہے۔ غرضیکہ پوری زندگی اگر محبت و یقین کے جذبہ سے خالی ہو تو وہ زندگی زندگی نہیں۔ بلکہ موت ہے۔ اور پھر ایسی زندگی کیا؟ جس میں طبیعتیں مردہ و افسردہ ہوں، نظم و نثر کے سرچشمے خشک ہوں، اور زندگی کے شعلے بجھ چکے ہوں، ایسی حالت میں یقین کامل اور حب صادق ہی حیات انسانی میں جلا پیدا کرتی ہے اور انسانی زندگی نور و رنگ سے معمور ہو جاتی ہے، پھر شستہ، پُر سوز و پُر درد روح نواز اور جاں بخش کلام سننے میں آتے ہیں، خوارق عادت شجاعت و قوت دیکھنے میں آتی ہے، اور علم و ادب کے نقوش بھی زندۂ جاوید بن جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ یہی محبت اگر پانی، مٹی اور اینٹ پتھر میں

داخل ہو جائے تو اس کو بھی زندۂ جاوید بنا دیتی ہے۔ ہمارے سامنے اسکی روشن مثال مسجد قرطبہ، قصر زہرا، اور تاج محل ہیں، سچ تو یہ ہے کہ محبت و یقین کے بغیر ادب وفن مردہ وافسردہ و ناتمام ہیں ؎

نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خونِ جگر کے بغیر

بڑی غلط فہمی میں لوگ مبتلا ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ اہل علم حضرات اپنی قوتِ علم، کثرتِ معلومات اور ذکاوت و ذہانت کی وجہ سے ایک دوسرے سے سبقت لے جاتے ہیں، یا ایک دوسرے پر فضیلت رکھتے ہیں۔ اور اسی طرح شعراء کو ان کی فطری قوتِ شاعری، لفظوں کا حسن انتخاب، معانی کی بلاغت انھیں ایک دوسرے سے ممتاز کرتی ہے، اور مصلحین وقت اور قائدینِ ملت کی بلندی دینی موقوف ہے ان کی ذہانت کی تیزی، خطابت کی بلندی، سیاسی سوجھ بوجھ اور حکمت علمی پر! حالانکہ ایسا نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کی فضیلت و بلندی کا دارومدار محبت و اخلاص پر ہے، ان کا حبّ صادق اور مقصد سے اخلاص کامل ہی ان کی عظمت و بزرگی کا سبب ہے، اس لئے کہ اس کا مقصد و موضوع اور غرض و غایت اس کی روح میں سرایت کر جاتی ہے قلب میں جاگزیں ہو جاتی ہے اور فکر و عمل پر چھا جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ

یہ ہوتا ہے کہ اس کی ذاتی خواہش مغلوب اور شخصیت گھٹ جاتی ہے،
اب وہ جب کوئی بات کرتا ہے تو مقصد کی زبان سے کرتا ہے جب کچھ
لکھتا ہے تو مقصد کے قلم سے لکھتا ہے، غرض کہ اس کے فکر و خیال، دل و دماغ
اور اس کی پوری زندگی پر اس کا مقصد چھا جاتا ہے۔

ایک عظیم گناہ جو اس جدید تمدن کا پیدا کردہ ہے۔ وہ ہے
مادہ پرستی، اور پھر اس سے نفع پسندی، جنسی محبت اور نفسانی خواہش!
یہ درحقیقت جدید عصری مادی تعلیم کا ثمرہ ہے۔ جس نے ہماری نئی نسلوں کو
تباہ کر رکھا ہے۔ اور آج حال یہ ہے کہ ان کے قلوب، ایمان کی حرارت
حب صادق کی تپش اور یقین کے سوز سے خالی ہیں، اور یہ عالم تو ایک
ایسی متحرک شئے بن کر رہ گیا ہے کہ جس میں نہ کوئی زندگی ہے، اور نہ کوئی
روح، نہ شعور و وجدان ہے، نہ مسرت و غم کا احساس! اس کی مثال
اس جامد شئے کی طرح ہے جو کسی جابر و قاہر شخص کے دست تصرف میں ہو
وہ جس طرح چاہے اسے حرکت دے اور استعمال کرے۔

جب آپ اقبال کے کلام میں مطالعہ کریں گے تو آپ کو اندازہ
ہو گا کہ اقبال کا کلام ہمارے جانے پہچانے شعراء سے بہت کچھ مختلف ہے
اقبال کا کلام ہمارے شعور و احساس، قلب و وجدان اور اعصاب میں
حرکت و حرارت، سوز و گداز، درد و تپش پیدا کرتا ہے، اور پھر ایک ایسا

شعلۂ جوالہ بن کر بھڑک اٹھتا ہے جس کی گرمی سے مادیت کی زنجیریں پگھل جاتی ہیں، فاسد معاشرہ اور باطل قدروں کے ڈھیر جل کر فنا ہوجاتے ہیں جس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کس قدر طاقت ور ایمان، پُر درد و پُرسوز سینہ اور بے چین روح رکھتا ہے، قابل صد ستائش ہے،

وہ دوسرا مدرسہ جس نے اتنی اچھی تربیت کی اور ایسی قابل قدر شخصیت تیار کی

اقبال کی شخصیت کو بنانے والا دوسرا عنصر وہ ہے جو آج ہر مسلمان گھر میں موجود ہے مگر افسوس کہ آج خود مسلمان اس کی روشنی سے محروم اس کی علم و حکمت سے بے بہرہ ہیں، میری مراد اس سے قرآن مجید ہے اقبال کی زندگی پر یہ عظیم کتاب جس قدر اثر انداز ہوئی ہے، اتنا نہ وہ کسی شخصیت سے متاثر ہوئے ہیں اور نہ کسی کتاب نے ان پر ایسا اثر ڈالا ہے

اقبال کا ایمان چونکہ "نو مسلم" کا سا ہے، خاندانی وراثت کے طور پر انھیں نہیں ملا ہے، اس لئے ان کے اندر نسلی مسلمانوں کے مقابلہ میں قرآن شریف سے شغف، تعلق، اور شعور و احساس کے ساتھ مطالعہ کا ذوق بہت زیادہ ہے۔ اقبال کا قرآن پڑھنا عام لوگوں کے پڑھنے سے بہت ہی مختلف رہا ہے، جیسا کہ خود اقبال نے اپنے قرآن مجید پڑھنے کے سلسلہ میں ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ ان کا یہ ہمیشہ کا دستور تھا کہ روزانہ بعد نماز صبح قرآن مجید کی تلاوت کیا کرتے تھے، اقبال کے والد جب

انھیں دیکھتے تو فرماتے کیا کر رہے ہو؟ اقبال جواب دیتے قرآن پڑھ رہا ہوں"۔ کچھ دنوں تک یہ سلسلہ جاری رہا آخر ایک دن اقبال نے پوچھا' ابا جان! آپ مجھ سے روزانہ پوچھتے ہیں اور میں ایک ہی جواب دیتا ہوں اور پھر آپ خاموش چلے جاتے ہیں، تو انھوں نے جواب دیا کہ میں تم سے کہنا چاہتا ہوں کہ تم قرآن اس طرح پڑھا کرو کہ جیسے قرآن اس وقت تم پر نازل ہو رہا ہے، اس کے بعد سے اقبال نے قرآن برابر سمجھ کر پڑھنا شروع کیا اور اس طرح کہ گویا وہ واقعی ان پر نازل ہو رہا ہے۔ اپنے ایک شعر میں بھی وہ اسکا اظہار یوں فرماتے ہیں ؎

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

علامہ اقبال نے اپنی پوری زندگی قرآن مجید میں غور و فکر اور تدبر و تفکر کرتے گذاری، قرآن مجید پڑھتے، قرآن سوچتے، قرآن بولتے، قرآن مجید ان کی وہ محبوب کتاب تھی جس سے انھیں نئے نئے علوم کا انکشاف ہوتا، اس سے انھیں ایک نیا یقین، ایک نئی روشنی، اور ایک نئی قوت و توانائی حاصل ہوتی، جوں جوں ان کا مطالعۂ قرآن بڑھتا گیا، ان کے فکر میں بلندی اور ایمان میں زیادتی ہوتی گئی

اس لئے کہ قرآن ہی ایک ایسی زندۂ جاوید کتاب ہے جو انسان کو ابدی علم اور ابدی سعادت سے بہرہ ور کر لیتی ہے، وہ ایک ایسی شاہ کلید ہے کہ حیات انسانی کے شعبوں میں جس شعبہ پر بھی اُسے لگائیے، فوراً کھل جائیگا، وہ زندگی کا ایک واضح دستور اور ظلمتوں میں روشنی کا مینار ہے۔

تیسرا عنصر جس کا اقبال کی شخصیت کی تعمیر میں بڑا دخل ہے وہ "عرفان نفس" اور خودی ہے۔ علاّمہ اقبال نے عرفان ذات پر بہت زور دیا ہے۔ انسانی شخصیت کی حقیقی تعمیر ان کے نزدیک منت پذیر "خودی" ہے جب تک عرفان ذات نہ حاصل ہو اس وقت تک زندگی میں نہ سوز و مستی ہے، اور نہ جذب و شوق! اس سلسلہ میں اقبال کے یہ اشعار ان کے فکر کی پوری ترجمانی کرتے ہیں ؎

اپنے مَن میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا، نہ بن، اپنا تو بَن

مَن کی دنیا؟ مَن کی دنیا، سوز و مستی جذب و شوق
تن کی دنیا؟ تن کی دنیا سود و سودا، مکر و فن

مَن کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں
تن کی دولت چھاؤں ہے، آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

مَن کی دنیا میں نہ پایا میں نے افرنگی کا راج

من کی دنیا میں نہ دیکھے ہیں نے شیخ و برہمن
پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا، نہ تن

ان کے کلام میں معنوی بلندی کے ساتھ ساتھ، لفظوں کی بندش، ہم آہنگی، اتار چڑھاؤ، روانی و تسلسل اور موسیقیت اس قدر زیادہ ہے کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔

علامہ اقبال کو خودی کی تربیت اور عرفان نفس پر بڑا اعتماد تھا ان کے نزدیک خود شناسی و خود آگاہی انسان کو اسرار شہنشہی سکھلاتی ہیں عطار ہوں یا رومی، رازی ہوں یا غزالی، بغیر عرفان نفس کسی کو کچھ حاصل نہیں ہوتا، اسی عرفان نفس کا نتیجہ تھا کہ اقبال نے اس رزق سے موت کو ترجیح دی جس رزق سے پرواز میں کوتاہی آتی ہو، اور دارا و سکندر سے وہ مرد فقیر اقبال کے خیال میں زیادہ بہتر ہے جس کی فقیری میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خو بو اور ان کا اسوہ ہو، اور حق تو یہ ہے کہ عرفان نفس اور عرفان ذات ہی کے حصول کے بعد انسان جرأت سے اس بات کا اظہار کر سکتا ہے، کہ ؎

آئین جوانمرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

اقبال کا تصورِ خودی خود اقبال میں اس قدر رچ بس گیا تھا
کہ ان کی زندگی عرفانِ نفس کا زندہ نمونہ تھی، ان کی زندگی کے اوراق میں
ان کی خودی، خود داری، خود اعتمادی کے نقوش بہت ابھرے ہوئے
نظر آتے ہیں، عرفان نفس ہی کیلئے دوسروں کو مخاطب کر کے در
اپنے آپ کو کہتے ہیں۔ ؎

اپنے رازق کو نہ پہچانے تو محتاج ملوک
اور پہچانے تو ہیں تیرے گدا دارا و جم
دل کی آزادی شہنشاہی، شکم سامان موت
فیصلہ تیرا ترے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم

بلاشبہ اقبال نے شکم کے مقابلہ میں دل کو ترجیح دی اور دل ہی کو اختیار کیا
یہ عرفان نفس ہی کا کرشمہ تھا جس نے اقبال کو ہر قسم کی فکری
گمراہی اور ادبی چاٹ سے محفوظ رکھا، حالانکہ یہی دونوں چیزیں
ہمارے عام ادباء و شعراء اور مصنفین کو ہر چراگاہ میں منھ مار لینے،
ہر وادی میں بھٹکنے، اور ہر موضوع پر لکھنے کو آمادہ کرتی ہیں، خواہ
وہ ان کے عقیدہ و خیال کے موافق ہو یا نہ ہو، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے
کہ وہ اپنی زندگی کے آخری ایام تک نہ اپنی شخصیت کو پہچانتے ہیں
اور نہ اپنے پیغام سے واقف ہوتے ہیں، لیکن اقبال نے اول ہی دن سے

اپنی ذات اور شخصیت کو اچھی طرح پہچانا ، اپنی ذہنی صلاحیتوں کا صحیح صحیح اندازہ کیا، اور پھر اپنی فکری صلاحیتوں، شعری قوتوں کو مسلمانوں کی زندگی کے ابھارنے ، ان میں روح و زندگی پیدا کرنے اور یقین و ایمان کی دبی ہوئی چنگاریوں کو بھڑکانے میں صرف کیا۔ اور ان میں قوتِ حریت اور سیادت و قیادت کا احساس دلایا۔
اقبال ایک فطری اور مذہبی شاعر تھے ، اگر وہ شاعر نہ بننے کی کوشش کرتے تو کامیاب نہ ہوتے شعر کہنے پر وہ مجبور تھے ، ان کی شاعری رِستے ہوئے قلب ، پرجوش و پرسوز دل ، معنی کی معنویت اور الفاظ کی شوکت کی آئینہ دار تھی ۔ وہ ایک قادر الکلام اور ماہر فن شاعر تھے ، ان کے ہمعصر شعرا ، نہ صرف یہ کہ ان کی امامت اور کلام میں اعجاز کے قائل تھے ، بلکہ زبان ، تراکیب ، معانی افکار ، جدّتِ تشبیہہ ہر چیز سے متأثر تھے ان کی شاعری کو عظیم بنانے میں انگریزی اور جرمن شعر و ادب اور فارسی شاعری کا بھی بڑا دخل ہے ، لیکن ان سب باتوں کے عرض کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اقبال کے ہمعصروں میں کوئی اچھا اور اونچا شاعر ہی نہ تھا ۔ بلکہ اچھے سے اچھے اونچے سے اونچے ادیب و شاعر موجود تھے ، جو اپنے الفاظ کی فصاحت، معنی کی بلاغت

استعارہ وتشبیہہ کی جدت میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے ، لیکن جو چیز کہ اقبال کو اپنے ہمعصروں سے ممتاز کر دیتی ہے ۔ وہ ہے ان کی شاعرانہ عظمت ، ادبی قوت ، فنی ذہانت ، جبلی عبقریت اور ان سب کے ساتھ ساتھ اسلام کا پیغام ! اقبال نہ ملکی شاعر تھے اور نہ وطنی ، اور نہ عام رومانی شاعروں کی طرح انکی شاعری بھی شراب و شاہد کی مرہون منت تھی ، اور نہ ان کی شاعری نری حکمت وفلسفہ کی شاعری تھی ، ان کے پاس اسلام کی دعوت اور قرآن کا پیغام تھا ، جس طرح ہوا کے جھونکے پھولوں کی خوشبو پھیلاتے ہیں اور جس طرح اس زمانے میں برقی لہروں سے پیغامات کے پہنچانے کا کام لیا جاتا ہے ۔ اسی طرح اقبال بھی اپنے اس پیغام کو شعر کی زبان میں کہتے تھے تاکہ ان کے پیغام کے لئے شعر ، برقی لہروں کا کام دے ۔ بلاشبہ اقبال کی شاعری نے خواب غفلت میں پڑی ہوئی قوم کو بیدار کیا اور ان کے دلوں میں ایمان ویقین کی چنگاری پیدا کر دی تو یہ سب کچھ صرف اس وجہ سے ہوا کہ اقبال نے اپنے آپ کو پہچانا ، اپنی وہبی شخصیت وقوت کا صحیح اندازہ کیا ، اوران کو اصلی مقام پر استعمال کیا ۔

اور وہ جو تھا عنصر جس نے اقبال کی شخصیت کو بنایا ،

پروان چڑھایا، اور اس کی شاعری کو نت نئے معانی، افکار کی جولانی اور قوتِ تاثیر عطا کی، ان میں کتابوں کی درس و تدریس اور مطالعہ کے شوق و انہماک کا کوئی دخل نہیں ہے۔ بلکہ اقبال کی "آہ سحر گاہی" اس کا اصلی سرچشمہ ہے۔ جب سارا عالم خواب غفلت میں پڑا سوتا رہتا اس اخیر شب میں اقبال کا اُٹھنا اور اپنے رب کے سامنے سجدہ ریز ہو جانا، پھر گڑگڑانا اور رونا، یہی چیز تھی جو اس کی روح کو ایک نیا نشاط، اس کے قلب کو ایک نئی روشنی اور اس کو ایک نئی فکری غذا عطا کرتی، پھر وہ ہر دن اپنے دوستوں اور پڑھنے والوں کے سامنے ایک نیا شعر پیش کرتا۔ جو انسان کو ایک نئی قوت ایک نئی روشنی اور ایک نئی زندگی عطا کرتا۔

اقبال کے نزدیک آہ سحر گاہی زندگی کا بہت ہی اہم سرمایہ ہے، بڑے سے بڑے عالم و زاہد اور حکیم و مفکر اس سے مستغنی نہیں، چنانچہ فرماتے ہیں ؎

عطار ہو رومی ہو رازی ہو غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی

اقبال صبح میں اُٹھنے کا بہت ہی اہتمام رکھتے تھے۔ سفر و حضر ہر مقام اور ہر کہیں ان کے لئے سحر خیزی ضروری تھی۔ ؎

زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آدابِ سحر خیزی

اور صرف یہیں تک نہیں بلکہ اس کی تمنا بھی کرتے ہیں کہ خداوندا مجھ سے تو جو چاہے چھین لے لیکن لذتِ آہ سحر گاہی سے مجھے محروم نہ کر ؎

نہ چھین لذتِ آہِ سحر گہی مجھ سے
نہ کر نگہہ سے تغافل کو التفات آمیز

یہی وجہ تھی کہ وہ جوانوں میں اپنی اس آہ و سوز اور درد و تپش کو دیکھنے کی تمنا کرتے تھے اور دعائیں کرتے کہ خداوندا یہ میرا سوزِ جگر اور مرا عشق و نظر آج کل کے مسلم نوجوانوں کو بخش دے ؎

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے
مرا عشق، میری نظر بخش دے

اس بات کو ایک دوسری نظم میں اس طرح فرماتے ہیں ؎

جوانوں کو مری آہِ سحر دے | تو اِن شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے | مرا نورِ بصیرت عام کر دے

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اقبال کے دل سے نکلی ہوئی یہ دعائیں بے اثر نہیں گئیں، اور آج سارے عالمِ اسلام میں خالص اسلامی فکر و نظر لئے، نوجوانوں کی ایک نسل ابھر رہی ہے ؎

دیکھئے اس بحر کی تہہ سے اچھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلو فری رنگ بدلتا ہے کیا

آخری مؤثر عنصر جس نے اقبال کی شخصیت کی تخلیق میں اہم حصہ لیا ہے وہ مولانا جلال الدین رومی کی "مثنوی معنوی" ہے یہ کتاب مولانا رومی کی مشہور مثنوی ہے جو فارسی زبان میں وجدانی تاثرات اندرونی شدت کی بنا پر لکھی گئی ہے۔ دراصل یونانی فلسفہ عقلیات مولانا روم کے دور میں جس طرح چھا چکا تھا اور کلامی مباحث، خشک فلسفیانہ موشگافیاں مسلمانوں کے ذہنوں، دینی مدرسوں اور علمی اداروں میں جس طرح سرایت کر چکی تھیں اس سے ہٹ کر کوئی شخص سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس صورت حال سے متاثر ہو کر مولنا روم نے مثنوی لکھنی شروع کی جو اپنے اندر قوت حیات کے ساتھ ساتھ ادبی بلندی، معانی کی جدت حکیمانہ مثالوں اور نکتوں کے بیش بہا خزینے سمیٹے ہوئی ہے۔ اس کتاب نے اس دور سے لے کر آج تک ہزاروں انسانوں کو متاثر کیا ہے ان کے قلب و نظر میں تبدیلی کی ہے۔ اسلامی کتب خانے میں اپنے انداز پر یہ ایک بے نظیر و بے مثال کتاب ہے۔ اس دور جدید میں جبکہ اقبال کو یورپ کے مادی و عقلی، بے روح و بے خدا افکار و خیالات پیش آئے

اور مادہ و روح کی کشمکش اپنے پورے عروج کے ساتھ سامنے آئی تو اس قلبی اضطراب اور فکری انتشار کے موقع پر اقبال نے مولانا روم کی مثنوی سے معاونت حاصل کی اس کشمکش میں مولانا روم نے ان کو بہت کچھ سہارا دیا یہاں تک کہ اقبال نے پیر روم کو اپنا کامل رہنما تسلیم کر لیا۔ اور صاف صاف اعلان کر دیا کہ عقل و خرد کی ساری گتھیاں جسے یورپ کی مادیت نے اور الجھا دیا ہے۔ ان کا حل صرف آتش رومیؒ کے سوز میں پنہاں ہے، اور مری نگاہ فکر اسی کے فیض سے روشن ہے، اور آج یہ اسی کا احسان ہے کہ میرے چھوٹے سے سبو میں فکر و نظر کا ایک بحر ذخار پوشیدہ ہے ؎

علاج آتش رومی کے سوز میں ہے ترا
تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں
اسی کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن
اسی کے فیض سے میرے سبو میں ہے جیحوں

مولانا روم سے اپنی اس عقیدت و محبت کا اظہار اقبال نے بار بار کیا ہے اور انھیں ہمیشہ "پیر روم" کے نام سے یاد کرتے ہیں ؎

صحبت پیر روم نے مجھ پہ کیا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سر بجیب، ایک کلیم سر بکف

اقبال اس بیسویں صدی کے خالص صنعتی و مادی دور میں پھر کسی "رومی" کے منتظر ہیں، ان کے نزدیک مادیت کا زنگ عشق کی بھٹی ہی میں صاف ہو سکتا ہے، اور اس کے لئے آتشِ رومی ہی کی ضرورت ہے۔

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گلِ ایراں وہی تبریز ہے ساقی

لیکن اقبال مایوس نہیں ہیں بلکہ اپنے کشت ویراں سے بہت ہی پر امید ہیں۔

نہیں ہے ناامید اقبالؔ اپنے کشت ویراں سے
ذرا نم ہو، تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

یہی وہ پانچ عناصر ہیں جنھوں نے اقبال کی شخصیت کی تخلیق کی اور یہ عناصر دراصل اسی دو کے مدرسے کے فیض و تربیت کے نتائج ہیں جنھوں نے اقبال کو مضبوط عقیدہ، قوی ایمان، سلیم فکر اور بلند مقام عطا کیا اور جس نے اقبال کو "اقبال" بنایا ـــــ!

اقبال کا نظریۂ شعر و ادب

ادبیات عالم پر اگر ایک نگاہ ڈالی جائے تو اقبال کی شاعری ایک ایسے تابندہ ستارے کے مانند نظر آئے گی، جس کی چمک دمک اور جگمگاہٹ، ادب و شعر کے عالمی کاروان کیلئے نشانِ راہ کا کام دیتی ہے اقبال کا ایک مخصوص ادبی تصور ہے، اور ادب و فن کے سلسلہ میں اس کا اپنا ایک مسلک ہے، یہی فنی مسلک[۱] ورادبی تصور اقبال کی پاکیزہ شاعری کا سرچشمہ ہے۔ اس کے آرٹ کا بنیادی محور زندگی آمیزی اور زندگی آموزی ہے۔ اس کے کلام کی اثر انگیزی میں جہاں اس کی بلند شخصیت، جذبہ کا خلوص طرزِ ادا کی ندرت کو دخل ہے۔ وہیں اس کا ادبی حسن یہ ہے کہ حیات آفرینی اور زندگی آمیزی سے اس کا فن مالامال ہے۔ وہ زندگی کے بحر بیکراں میں غوطہ زن ہو کر ایک طرف معانی کی غواصی کرتا ہے تو دوسری طرف ادب و شعر کے بیش بہا جواہر ریزے اور فن کے قیمتی موتی نکالتا ہے۔ وہ زندگی کے ساحل پر کھڑا ہو کر اس کا دوسرے

صرف تماشائی نہیں ہے۔ بلکہ زندگی کی تب و تاب کا جویا ہے۔ اقبال کارزارِ حیات سے دور رہ کر "طریقِ نے نوازی" کو "ہلاکیٔ امم" کا باعث سمجھتا ہے ؂

نہ جدا رہے اگر تو تب و تاب زندگی سے
کہ ہلاکیٔ امم ہے یہ طریقِ نے نوازی

اور بلاشبہ اقبال کی شاعری زندگی آمیزی اور زندگی آموزی کا ایک ایسا اعلیٰ نمونہ ہے، جس سے اچھی مثال کم از کم اردو شاعری میں نہیں پیش کی جا سکتی، اس کے نغموں کی دلکشی و دل آویزی نے برصغیر ہند کی نئی نسلوں پر بڑا گہرا نقش چھوڑا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے نغموں کی بازگشت آج بھی ادب میں گونج رہی ہے — اقبال نے ادب یا شاعری کو ذہنی تلذذ یا پیشہ کے طور پر کبھی نہیں اپنایا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے آرٹ، ادب اور شاعری کا مقصدِ عظیم، کائنات کے اسرارِ سربستہ کی پردہ کشائی اور اشارات و کنایات میں ایک ایسے نظامِ حیات کی نشاندہی تھی جو اس مادہ پرست اور بے خدا دنیا کو ہلاکت و بربادی سے بچا سکے۔ مغرب کی مادہ پرستی نے مشرق پر بھی بڑا گہرا اثر ڈالا تھا، جس نے مشرق کی اخلاقی و روحانی قدروں کو بڑی حد تک مضمحل کر دیا تھا۔

اقبال جہاں مشرق کا قدر داں تھا وہاں مغرب کو بھی بہت ہی قریب سے دیکھا تھا، اور وہ یہ دیکھ رہا تھا کہ یہ تہذیب مغرب اپنے خنجر سے آپ خود کشی کر رہی ہے، ایسے موقع پر اگر یہ مشرق کا ٹمٹماتا ہوا دیا بھی بجھ گیا تو پھر کائنات میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے، اقبال نے نہ صرف یہ کہ مشرق کی روحانی واخلاقی قدروں کا چراغ روشن رکھا بلکہ اس میں اپنے خون جگر سے نور و تابندگی بخشی، جس نے نوجوانوں میں اس کے فکر و نظر کو پروان چڑھایا اور انہیں اس کا سوزِ جگر عطا کیا اس کی وجہ دراصل یہی ہے کہ اقبال نے ادب کو ادب کی خاطر کبھی نہیں اپنایا۔ بلکہ ان کا مقصد "محرمِ رازِ درون میخانہ" بن کر اس کو افشا کرنا تھا۔

ہر بڑے ادیب و شاعر کے کلام کا اگر تجزیہ کیا جائے تو یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ اس کا ادب اور فنِ شاعری اپنے پس منظر میں ایک مخصوص تصور لئے ہوتا ہے، جو اس کے تصور کائنات انسان اور زندگی سے ہم آہنگ ہوتا ہے، اسی طرح اقبال کا تصورِ شعر و ادب بھی اپنی ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے، اور وہ اپنے ادب و فن کو حیات کی تعمیر و تہذیب کا ذریعہ سمجھتا ہے، اس کے نزدیک حقیقی ادب و فن اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتا، جب تک کہ

کسی ادیب وشاعر کا اندروں اُسے کچھ کہنے اور لکھنے پر مجبور نہ کر دے
اقبال ادب و شعر کی تخلیق کیلئے صرف ذہنی ورزش کا قائل نہیں۔
اس کا مقصدی جذبہ اور عشق اسے اظہارِ خیال پر آمادہ کرتا ہے۔
ایک گہرے جذبہ اور عشق کی جو کیفیت ادیب وشاعر پر طاری ہوتی ہے
وہی کیفیت ایک اچھے ادیب وشاعر کے فن کی جان ہے۔ یہ
کیفیت بڑی حد تک شاعر کے داخلی احساسات پر منحصر ہوتی ہے۔
لیکن اقبال جیسا شاعر صرف اپنے داخلی احساسات پر بھروسہ نہیں کرتا
بلکہ اس کے سامنے خارجی عوامل بھی ہوتے ہیں، وہ کائنات کے
روزانہ پیدا ہونے والے نت نئے مسائل اپنی نگاہوں کے سامنے
رکھتا ہے، وہ زندگی سے گریزاں نہیں، بلکہ زندگی کو اپنے اندر
سموئے رہتا ہے، تاکہ خارجی تجربوں اور اثرات سے اپنے ادب و
شعر میں حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر اختیار کرے۔ ایک اچھے اور
اعلیٰ درجہ کے ادیب وشاعر میں جہاں داخلی طور پر احساس کی شدت
ہوتی ہے وہیں اس میں خارجی تجربوں کی گہرائی سے حقیقت پسندی بھی
آتی ہے۔ اردو شاعری میں داخلی و خارجی عناصر کا سب سے اچھا
امتزاج ہمیں اقبال کی شاعری میں ملتا ہے، اس کی شاعری کے اندر
حسن آفرینی کے ساتھ ساتھ کائنات کی تعمیر کا جذبہ، انسانیت کی ہمدردی

اس کا مسرت وغم، ملک وملت کا درد، غرض کہ نت نئے مسائل حیات کی
اس طرح آمیزش ہوتی ہے۔ ع

شاخ گل میں جس طرح باد سحر گاہی کا نم

اقبال حقیقی معنوں میں شاعر حیات ہے اور اس کے ادب وفن کا مقصد
خدمت حیات ہے ۔ ؎

علم وفن از پیش خیزان حیات
علم وفن از خانہ زادان حیات

اقبال کے تصور شعر وادب میں جہاں حیات آفرینی ہوتی ہے
وہیں اس کی بڑی خوبی اس کا خلوص اور جذبۂ عشق ہے، جذبہ کا
خلوص ہی اس کی شاعری میں قوس قزح کی رنگینی اور شعلہ کی گرمی پیدا کرتا ہے
جب تک رگ ساز میں صاحب ساز کا لہو رواں نہو، اس وقت تک
ادب وشعر کے سارے نقوش مردہ وافسردہ وناتمام ہی رہتے ہیں۔ یہ جذبہ
کا خلوص ہی رہتا ہے جو خون دل وجگر کی صورت میں شاعر کے ریشے
ریشے میں سما جاتا ہے۔ اور جس سے اس کی نوا کی پرورش ہوتی ہے۔ اگر
کسی فنکار اور ادیب وشاعر کا سینہ اس خلوص اور جذبہ سے خالی ہے
تو حقیقتاً وہ فنکار اور آرٹسٹ نہیں ہے۔ اس لئے کہ سچا فنکار اپنے
فن کے خلوص سے حیات کو تابانی بخشتا ہے اور انسانیت کے خوابیدہ تاروں کو

چھیڑ کر ان میں ساز کی جھنکار اور لہر دوڑاتا ہے، ساتھ ہی اسے مسرت و شادمانی سے ہمکنار کرتا ہے، ادب و فن کا خلوص ہی اُسے شئے کی حقیقت کا جویا بناتا ہے، ورنہ نرا ذوق نظر اپنی جگہ خوب ہوتے ہوئے بھی کوئی پسندیدہ شئے نہیں۔ ایسا ادیب و شاعر اور فنکار جو زندگی کی الجھی ہوئی حقیقتوں پر نظر نہ رکھے، اور اسکے فن و ادب سے مسرت و بصیرت دونوں ہی حاصل نہ ہوں بے معنی اور مہمل ہے، اس لئے کہ حقیقتاً "مقصودِ ہنر" "سوز حیات ابدی" ہے اور فن و ادب کے اس جذبہ اور خلوص کو اقبال نے "خون جگر" سے تعبیر کیا ہے۔ ؎

نغمہ می باید جنوں پروردۂ
آتشے در خون دل حل کردۂ

حقیقت یہ ہے کہ ادب و شعر کے وادی میں قدم رکھنا ہر کس و ناکس کا کام نہیں، غالبؔ کی زبان میں ع

پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

غالبؔ نے بھی "دل گداختہ" سے اسی "فنکارانہ خلوص" اور "جذبۂ عشق" کی طرف اشارہ کیا ہے۔

مختصر یہ کہ اقبال کے شعر و ادب میں جذبات کو بڑی اہمیت

حاصل ہے۔ جذبات کی گرمی اور خلوص کی فراوانی اسکے فن کی جان اور روح ہے، اس لئے کہ جذبات کا تعلق بڑی حد تک دل سے ہے اور دل سے زیادہ حساس اور بیدار کوئی شئے نہیں، دل انسانی زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے اس کے جینے سے زندگی عبارت ہے۔ دل کی حسن آفرینی، جذبۂ عشق اور خلوص، یہ ساری چیزیں اقبال کے شعر وادب میں حسن وتابش، فکر ودانش اور درد وتپش پیدا کرتی ہیں جس سے اس کی شاعری زندہ جاوید بن گئی ہے۔

اقبال کی شاعری کا اگر فنی تجزیہ کیا جائے اور اس کے ادبی حسن وجمال کو سامنے لایا جائے، تو اس سے اسکی شاعری کا حقیقی فن اجاگر ہوکر سامنے آئے گا اور ہم اقبال کے نظریۂ شعر وادب کو صحیح معنوں میں سمجھ سکیں گے۔

اقبال کی شاعری کے بنیادی عناصر میں اس کا جذبہ، اس کا خلوص، اس کا عشق نمایاں ہے۔ جسے وہ یقین کی روشنی، فکر کی تابانی اور عمل پیہم سے جلا بخشتے ہیں اور پھر ان سے ادب وشعر کی جو تخلیق ہوتی ہے۔ اس میں نادر تشبیہات، شاعرانہ مصوری تخیلی پیکر، کردار کی خوبی اور اثر آفرینی پائی جاتی ہے۔ اور یہ اقبال کے شعر وادب کی ایسی لازوال خوبیاں ہیں جن سے ان کے فن کی تابندگی

اور جگمگاہٹ ہمیشہ باقی رہے گی ۔

اقبال کی نادر تشبیہیں اس کے عروس کلام کے ایسے زیور ہیں جن سے اس کے چہرے کے خط و خال میں نکھار اور اسکی چمک دمک دوبالا ہو جاتی ہے ۔ اقبال کی نظم "جگنو" "شمع اور شاعر" وغیرہ میں نادر تشبیہات اپنے فنی کمال کے ساتھ جلوہ گر ہیں " پھولوں کی انجمن کی شمع " مہتاب کی کرن " "شب کی سلطنت میں دن کا سفیر" جوئے سرود آفریں اور " دختر خوش خرام ابر " وغیرہ ایسی زندہ جاوید تشبیہیں ہیں جو اقبال کی عروس شاعری کے رخ روشن پر غازہ کی طرح ہمیشہ چمکتی رہینگی ۔

اقبال کی شاعری کی یہ نادر اور لازوال تشبیہیں جہاں کلام کے حسن کو دوبالا کرتی ہیں وہیں کلام اقبال کی ایک دوسری خوبی ان کی فنکارانہ مصوری بھی ہے ۔ اقبال کی بعض نظمیں اس کی فنکارانہ مصوری کی بہترین مثالیں ہیں اس کی نظم " ذوق وشوق " میں جہاں جذبۂ خلوص اور محبت کی وارفتگی ہے ۔ وہیں شاعرانہ مصوری میں بھی یہ نظم ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے اس نظم کے یہ چند اشعار اس کی فنکارانہ مصوری کی بولتی ہوئی تصویریں ہیں ۔

قلب و نظر کی زندگی دشت میں صبح کا سماں

چشمۂ آفتاب سے نور کی ندیاں رواں

حسنِ ازل کی ہے نمود، چاک ہے پردۂ وجود
دل کیلئے ہزار سود، ایک نگاہ کا زیاں

سرخ و کبود بدلیاں چھوڑ گیا سحابِ شب
کوہِ اضم کو دے گیا رنگ برنگ طیلساں

گرد سے پاک ہے ہوا برگِ نخیل دھل گئے
ریگِ نواحِ کاظمہ نرم ہے مثلِ پرنیاں

آگ بجھی ہوئی ادھر، ٹوٹی ہوئی طناب ادھر
کیا خبر اس مقام سے گزرے ہیں کتنے کارواں

اسی طرح اقبال کی نظم "ایک آرزو" اپنی مصوری اور منظر کشی میں بے مثال ہے۔ دامنِ کوہ میں شاعر کے تنہا رہنے کی آرزو، چھوٹا سا جھونپڑا اور ندی کا کنارا، اس منظر کو جب شاعر کے تخیل نے شعری قالب میں ڈھالا تو اس سے نہ صرف یہ کہ فطرت کی تصویر کھنچ کر رہ گئی ہے بلکہ بعض اچھوتے خیالات اور دلکش تشبیہات نے ایک نیا جادو جگایا ہے۔ نظم کے چند اشعار ملاحظہ ہوں، ؎

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہوں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہو

ہو دل فریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہو

پانی کو چھو رہی ہو جھک جھک کے گل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو

کہسار کے نظارہ کی دلفریبی کو، پانی کی موج کا اٹھ اٹھ کر دیکھنا اگر ایک نادر خیال ہے تو گل کی ٹہنی کا پانی کو جھک جھک کے اس طرح چھونا ع جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہو ایک دلکش تشبیہہ ہے اور اقبال کی شاعری ایسے اچھوتے خیالات اور نادر تشبیہات سے بھری پڑی ہے۔

اقبال کے شعر و ادب نے عالمی ادب پر جو نقش دوام چھوڑا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے اشعار میں فکر و فن باہم آمیز ہو کر جذبہ بن گئے ہیں اور اسی جذبہ نے ان کی شاعری میں ایک غیر معمولی تاثیر پیدا کر دی ہے۔ یہ جذبہ اور خلوص ہی کا جادو ہے کہ آج اقبال کا بڑے سے بڑا مخالف بھی اس کی شاعری سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، اقبال کی شاعری میں تاثیر و تاثر اور اثر آفرینی کے بے شمار اعلیٰ نمونے ملتے ہیں "طارق کی دعا، اندلس کے میدان جنگ میں" اپنی اثر آفرینی کے لحاظ سے ایک بے مثال نظم ہے۔

یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے
جنھیں تو نے بخشا ہے ذوق خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے دریا و صحرا

سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذتِ آشنائی
شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت، نہ کشور کشائی

خیاباں میں ہے منتظر لالہ کب سے
قبا چاہیے اس کو خونِ عرب سے
کیا تو نے صحرا نشینوں کو یکتا
خبر میں، نظر میں، اذانِ سحر میں
طلب جس کی صدیوں سے تھی زندگی کو
وہ سوز اس نے پایا انہیں کے جگر میں
کشادِ درِ دل سمجھتے ہیں اس کو
ہلاکت نہیں موت ان کی نظر میں
دلِ مردِ مومن میں پھر زندہ کر دے
وہ بجلی کہ تھی نعرۂ لاتذر میں
عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے
نگاہِ مسلماں کو تلوار کر دے

اس نظم میں بہتے ہوئے آبشار کی نغمگی، ٹوٹے ہوئے ساز کی جھنکار جذبہ کا خلوص اور درد و سوز سب کچھ پنہاں ہے، جس سے اس کی اثر آفرینی دوچند ہو گئی ہے۔

اقبال کی نظمیں اس لحاظ سے اردو شاعری میں بڑا اونچا مقام رکھتی ہیں کہ اُن کی نظموں میں بیک وقت جذبہ کا خلوص، اثر آفرینی درد و تپش، فکر و دانش، سوز و ساز، اور درد و داغ اس طرح ہم آہنگ ہوتے ہیں کہ اس کے نغموں میں ہم کھو جاتے ہیں اور جن سے ہماری روح جاگ اُٹھتی ہے۔ اور فن کی خوبی سے اُس کا ادبی حُسن لازوال بن جاتا ہے۔ سرزمین اندلس میں "عبدالرحمٰن اول کا بویا ہوا کھجور کا پہلا درخت" اقبال کے فنی و شعری کمال کا نہایت اعلیٰ نمونہ ہے۔ کھجور کے ایک درخت کو غریب الوطنی میں عرب فاتح دیکھ کر جن جذبات سے دوچار ہوتا ہے۔ اس کی تصویر کشی میں اقبال نے اپنی جس فنی مہارت کا ثبوت دیا ہے وہ آرٹ کا ایک بیش بہا نمونہ ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

مری آنکھوں کا نور ہے تو — میرے دل کا سرور ہے تو
اپنی وادی سے دور ہوں میں — میرے لئے نخل طور ہے تو
مغرب کی ہوا نے تجھ کو پالا — صحرائے عرب کی حور ہے تو

ہمت کو شناوری مبارک پیدا نہیں بحر کا کنارا
صبح غربت میں اور چمکا ٹوٹا ہوا شام کا ستارا
مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے مومن کا مقام ہر کہیں ہے

اس چھوٹی سی نظم میں سادگی و پرکاری اور دلکشی و دل آویزی دونوں ہی پائی جاتی ہے اور ساتھ ہی فن شاعری کی انجمن میں فکر و عمل کے جگنو چمکتے نظر آتے ہیں۔

اقبال کی یوں تو اکثر نظمیں بڑی پیاری دلکش اور فکر انگیز ہیں لیکن ان کی نظموں میں ایک نظم "مسجد قرطبہ" جدید اردو شاعری کی شاہکار ہے۔ اس میں آرٹ، تاریخ، اور فلسفہ اس خوش اسلوبی سے سموئے گئے ہیں اور اس طرح ہم آمیز ہیں کہ اس کی دلکشی و فکر انگیزی نے ایک طلسم سا پیدا کر دیا ہے اس نظم کا اگر تجزیہ کیا جائے تو اس کیلئے مستقل ایک مضمون درکار ہے۔ جس کا یہاں کوئی موقع نہیں، اور نہ صرف چند اشعار کے نمونے سے اس نظم کی صحیح کیفیت اور اس کی حقیقی لذت سے ہم لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ یہ پوری نظم شاعر کے فنی و فکری ارتقاء کی ایک ایسی شاہکار ہے جو اردو شاعری میں زندہ جاوید رہے گی۔

اقبال نے اندلس کی سرزمین میں اسلامی تہذیب و تمدن کے جو نقش و نگار دیکھے اور اس سے اس کا ضمیر و وجدان جس طرح متاثر ہوا،

"مسجد قرطبہ" اس کی ایک مثالی تصویر ہے جس کے در و دیوار پر ایک زندہ و پائندہ قوم کے عمل و کردار کے نقوش ثبت ہیں، جسے دیکھ کر مرد مومن کا راز آشکارا ہو جاتا ہے، مسجد قرطبہ کے جلال و جمال میں اقبال کو اس مرد مومن کے جلال و جمال کی روح منعکس نظر آتی ہے جو اس کا مثالی انسان ہے، اور وہ "آب روان کبیر" کے کنارے بیٹھ کر کسی اور زمانے کا خواب دیکھنے لگتا ہے اور ایک "عالم نو" کی "سحر" اس کی نگاہوں میں بے حجاب ہو جاتی ہے۔

اقبال کی نظموں میں یہ نظم ہمیں مختلف حیثیتوں سے بڑی ممتاز اور منفرد نظر آتی ہے، اس میں فکر و فن کا وہ نقطۂ عروج پایا جاتا ہے جو عموماً عالمی ادب و شعر کا طرۂ امتیاز ہے۔

اقبال کی شاعری نے جہاں نظموں میں کھلے رنگ رنگ کھلائے ہیں، جن کی رنگینی، حسن اور دلکشی سے اردو شاعری پر بہار آئی ہے۔ وہیں اقبال کی غزلیں! عشق و محبت کے واردات جذب و مستی کے اظہار، تغزل، جوش بیان اور بھرپور مقصدیت اور فنکارانہ خلوص کے اعلیٰ نمونے ہیں۔

رشید احمد صدیقی نے غزل کو اردو شاعری کی آبرو لکھا ہے اور کلیم الدین احمد نے اسے نیم وحشی صنف شاعری سے تعبیر کیا ہے۔

اگر جہانِ شعر و ادب میں اقبال کا وجود نہ ہوا ہوتا، اور ہم اقبال کی
غزلوں کی نغمہ سنجی سے اپنے شعور و وجدان کو جلا نہ بخشتے ہوتے تو
بہت ممکن تھا کہ کلیم الدین احمد کے خواب کی اس تعبیر کے لئے وجہ جواز
کوئی صورت نکل آتی، لیکن اقبال اور ان کے چند ہمعصروں کی
غزلوں نے اردو غزل گوئی پر سے اس الزام کو دور کر دیا کہ یہ دور
انحطاط کی مریضانہ شاعری کی عکاس ہے۔ اقبال کی غزل میں ہمیں
جو قوت و تازگی، حسن ادا، حسن تاثیر، زندگی، گرم نفسی اور جاندار
رمز و ایما ملتے ہیں، ان کو دیکھتے ہوئے بلاشبہ یہ بات کہی جا سکتی ہے
کہ غزل اردو شاعری کی آبرو ہے۔

غزل کی ایمائی کیفیت، نازک خیالی اور جذبات کی گرمی کا
بلند ترین اور اعلیٰ معیار غالب نے اردو میں، اور حافظ نے فارسی میں
اپنی شعری تخلیقات سے قائم کیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اردو اور
فارسی غزلوں میں ان کی ہمسری ممکن نہیں، لیکن رفتہ رفتہ اردو غزل
مجازی عشق و محبت، ہجر و وصال، لب و رخسار اور زلف و گیسو میں
الجھ کر رہ گئی، اس طرح گویا اردو شاعری حسن و عشق کے سستے جذبات
میں کھو کر گم ہو گئی اور یہ جذباتیت بھی زیادہ عرصہ تک غزل کا ساتھ
نہ دے سکی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ابتدا میں غزلوں کے مضامین میں جو تنوع

لطف اور لذت خیال ہوتی تھی وہ بھی باقی نہیں رہی، اور پھر معاملہ بندی قافیہ پیمائی، تقلید پرستی اور لفظی الٹ پھیر غزلوں کے معیار قرار پائے۔

اقبال نے غزل کی اس مریضانہ کیفیت کو یکسر بدل دیا۔ اور غزل کے لئے ایک ایسا صحت مند اور پاکیزہ قالب عطا کیا، جس نے اس صنف شاعری کو پھر سے زندہ جاوید بنا دیا، اور اسی گل و لالہ زلف و گیسو اور جام و مینا میں اپنے آتشیں نفسی سے ایک نئی جان ڈال دی، اس طرح الفاظ کے معنی بدل گئے، بے جان لفظوں کو جاندار بنا دیا، جو عیش کوشی اور تن آسانی کی علامت تھے، وہی الفاظ حرکت و عمل کے حدی خواں ثابت ہوئے۔

اقبال کی غزل کی اہم خصوصیت اس کا جاندار رمز و ایماء فکر انگیز جوش بیان اور صحت مند قوت و توانائی ہے۔ اور ساتھ ہی اقبال کا جذب و مستی اس کی غزل کی روح اور جان ہے۔ مگر یہ جذب و مستی شراب و شاہد کی نہیں ہے جس میں مدہوشی و آشفتہ حالی ہو، بلکہ یہ جذب و مستی نیک کرداری اور حرکت و عمل کی ہے، جس میں عقل و خرد کے روشن چراغ جلتے نظر آتے ہیں۔

اقبال کی غزلیں ان تین عناصر فکر انگیز جوش بیان، جاندار رمز و ایما اور صحت مند قوت و توانائی کی آئینہ دار ہیں، اقبال کے

بالکل ابتدائی زمانہ کا یہ شعر ہے

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

آج کے اچھے سے اچھے دیوان پر بھاری ہے اور ایسا فکر بخش جوش و رمز نیت ہے۔ جس کی مثال اردو شاعری میں کم تر ہی پیش کی جا سکتی ہے

اقبال کا خیال انگیز جوش بیان، لفظوں کے استعمال کا حسن اور اُن کی تازگی دیکھنا ہو تو اس غزل کو پڑھئے ہے

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں
تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے، ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں
نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرمِ خانہ خراب کو ترے عفوِ بندہ نواز میں
نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں

حقیقت یہ ہے کہ ان چند اشعار میں غزل کی وہ تمام شوخیاں اور گرمیاں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں جو آجکل غزل کی دنیا میں معیاری سمجھی جاتی ہیں

اور ساتھ ہی ساتھ ایسے جاندار رمز و ایما ہیں جو حسین ترکیبوں اور
دل آویز تشبیہوں کے آئینہ میں اپنی ایمائی قوت کو دوبالا کر رہی ہیں
اقبال کی رعنائی فکر اور شوخی گفتار نے غزل کی زمین میں وہ
گل کاری کی ہے جن میں حسن و دل کشی بھی ہے اور بے باکی و شوخی بھی!

فرماتے ہیں ؎

رمز یں ہیں محبت کی، گستاخی و بیباکی — ہر شوخ نہیں گستاخ ہر جذبہ نہیں بیباک

متاع بے بہا ہے درد و سوز آرزو مندی — مقام بندگی دیکر نہ لوں شان خداوندی

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں — ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

نہ کر تقلید اے جبریل میرے جذب و مستی کی — تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ

چلتے چلتے اقبال کی اس غزل کے چند اشعار کو ملاحظہ فرمائیے جس میں
اقبال اپنے کمال فن کے اس بلند ترین مقام پر فائز ہیں جہاں پہنچنا
ہر "مدعی کا" کام نہیں ؎

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر — ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر

عشق بھی ہو حجاب میں حسن بھی ہو حجاب میں
یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر

نغمۂ نو بہار اگر میرے نصیب میں نہ ہو
اس دم نیم سوز کو طائرک بہار کر

اس غزل میں شوخی وبیباکی، احساس کی شدت اور گہرائی، پیرایۂ بیان کی خوبی، جوش بیان اور رمز وایما سب کچھ موجود ہے۔

اقبال کے شعر وادب اور آرٹ میں اور زندگی کے تصور میں قوت وتوانائی کی روح کارفرما ہے، یہی وجہ ہے کہ جہاں کہیں بھی کائنات اور اس کے مظاہر میں قوت وتوانائی کا جلوہ نظر آتا ہے، اقبال کی نگاہیں اسے جالیتی ہیں، اقبال کے یہاں جمالیاتی تصور کے ساتھ جلالی عنصر کی بھی فراوانی ہے، اس کے تخلیقی محرکات بہت ہی متنوع ہیں، لیکن اس کی شعری تخلیقات کا سب سے بڑا محرک اس کا یہی تصور جلال وجمال ہے قوت ہی میں اُسے حسن دکھائی دیتا ہے، اور جلال ہی میں جمال کی عکاسی نظر آتی ہے۔ اسی کو اُس نے "دلبری بے قاہری" اور "دلبری با قاہری" سے تعبیر کیا ہے ؎

دلبری بے قاہری جادوگری است
دلبری با قاہری پیغمبری است

اقبال کے شعر و ادب میں تصورِ جلال و جمال کو سمجھنے کے لئے

اس کی نظم "جلال و جمال" کے یہ چند اشعار پیش کر دینا مناسب ہے ؎

مرے لئے فقط زورِ حیدری کافی | تیرے نصیب فلاطوں کی تیزیٔ ادراک
مری نظر میں یہی ہے جمال و زیبائی | کہ سر بسجدہ ہیں قوت کے سامنے افلاک

نہ ہو جلال تو حسن و جمال بے تاثیر
نرا نفس ہے اگر ہو نہ نغمہ آتش ناک

اقبال "افلاطون کی تیزیٔ ادراک" کے مقابلہ میں "زورِ حیدری" حیات کیلئے زیادہ اہم اور قابل قدر سمجھتا ہے، نری قوت و توانائی اس کے نزدیک پسندیدہ نہیں، اس لئے کہ طاقت و قوت ظالم کے ہاتھوں میں آ کر انسانیت کیلئے ایک لعنت بھی بن سکتی ہے۔ "زورِ حیدری" کا اشارہ اس اخلاقی طاقت کی طرف ہے، جو خدا کے سامنے احساس جوابدہی کے بعد پیدا ہوتا ہے، جلال و جمال کا یہ صحت مند تصور اگر شعر و ادب میں نہ ہو تو اقبال کے نزدیک نرا حسن و جمال بے تاثیر ہے۔ اگر نغمہ میں نفسِ آتشیں کی حرارت نہ ہو، تو نغمہ، نغمہ نہیں ہے، "نرا نفس" اور "سودائے خام" ہے۔

اقبالؔ اور عشقِ رسولؐ

آسمان ادب پر اقبال ایک روشن ستارہ کی طرح نمودار ہوا، اور کچھ ہی دنوں کے بعد آفتاب بن کر چمکا اور اپنی تیز روشن کرنوں سے سارے عالم ادب کو ڈھانک لیا، پھر اردو شاعری کے سینکڑوں روشن ستارے اس "مہر نیم روز" کے آگے ماند پڑ گئے ؎

جب مہر نمایاں ہوا سب چھپ گئے تارے
تو مجھ کو بھری بزم میں تنہا نظر آیا

اردو شاعری کی بھری بزم میں اقبال کی انفرادیت اور اپنے ہم عصروں میں اس کی امتیازی خصوصیت، صرف اس کی زبان و فن کی بلندی اور فطری شعری صلاحیتوں کی مرہون منت نہیں ہے بلکہ حقیقتاً اقبال کی شاعری کا تمام تر انحصار اس کی معنویت پر ہے۔ اردو شاعری کو غالبؔ نے ایک فکر عطا کی، لیکن اقبال نے فکر کو روشنی و تابندگی بخشی، یہی وجہ ہے کہ اقبال کے کلام کے ظاہری رنگ و روغن سے اس کا اندروں زیادہ روشن و تابناک ہے۔ اقبال کا یہ سوز دروں دراصل اسکے

یقین کی اس روشن مشعل کا مرہون منت ہے جو اس کے قلب میں فروزاں تھی، ورنہ جہاں تک تخیل کی بلند پروازی اور رفعت کا تعلق ہے غالب کچھ کم نہیں اردو شاعری میں اُن کا بڑا اونچا مقام ہے، مگر غالب کی رفعتِ فکر و نظر اُن کی "تشکیک" سے آگے نہ بڑھ سکی اور اسی چیز نے انہیں قنوطی بنا رکھا تھا وہ اقبال کے اس "یقین و ایمان" کو نہ پا سکے جس سے اس کا دل روشن اور ذہن و فکر تابندہ تھا اور اسی یقین نے انہیں "رجائیت" کی اس منزل پر پہنچایا، جہاں پہنچنے سے کتنے فکرِ بلند اور ذہنِ رسا کے پَر جلتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میرؔ کا "سوز" درد کی اثرانگیزی اور غالبؔ کی رفعتِ تخیل کا اقبال میں ایک حسین امتزاج ہے سوز و اثرانگیزی اور رفعتِ تخیل کا یہ چراغ اقبال نے اپنے یقین کے اسی سوزِ دروں سے روشن کیا جو اُن کے نہاں خانۂ دل میں ہمیشہ شعلہ تپاں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی ظلمتِ شب میں بھٹکتے ہوئے قافلے کے لئے اقبال کی یہ شعلہ نوا قندیل ثابت ہوتا ہے اور حیات کو پرسوز طربناک بناتا ہے ؏

مئے یقیں سے ضمیرِ حیات ہے پُرسوز

اقبال کی شاعری میں جو ہم یقین کا نور اور عشق کا سرور پاتے ہیں وہ جہاں "صحبتِ پیرِ روم" کا فیض ہے، وہیں اس میں اُن کے "سرشتِ عاشقانہ"

کا بھی بڑا دخل ہے ؎

مجواز من کلام عارفانہ
کہ من دارم سرشت عاشقانہ

اور سچ تو یہ ہے کہ عشق و محبت کی وارفتگی ہی نے اقبال کو " یقین " کی لذت سے آشنا کیا۔ اقبال کے نزدیک "عشق" سرمایۂ حیات ہے اور عشق ایک ایسا جذبہ ہے جو انسان کو سوز و ساز، درد و داغ اور تب و تاب بخشتا ہے۔ تاریخ انسانیت کے وہ نقوش جو ابھرے ہوئے روشن دکھائی دیتے ہیں وہ عشق ہی کے مرہون منت ہیں۔ صدق خلیل بھی ہے عشق، صبر حسین بھی عشق ہے اور کارزار حیات میں بدر و حنین کا واقعہ بھی عشق ہی کا کرشمہ ہے۔ اقبال کا عشق جہاں ظاہر میں سوزناک و آتشیں ہے، وہیں اس کا باطن " نور رب العلمین " ہے۔ اسی لئے اقبال نے کہا ہے ؎

وہ عشق جس کی شمع بجھا دے اجل کی پھونک
اس میں مزا نہیں تپش و انتظار کا

ایسا ہی عشق جاوداں " بر طریق مصطفٰیؐ محکم بپئے " کے مصداق ہوتا ہے اقبال کے کلام کا مطالعہ ہمیں اس حقیقت کی اچھی نشاندہی کرتا ہے کہ اقبال عشق رسولؐ میں کس قدر سرشار تھے، انکی حیات عشق نبویؐ کے سوز سے

تابناک و آتشناک تھی اور اُن کے فکر کی ساری روشنی و تابندگی "چراغ مصطفوی" ہی سے فروزاں تھی۔ اس سے پہلے کہ ہم "اقبال و عشق رسول" کے سلسلہ میں کلام اقبال کا ذرا تفصیلی جائزہ لیں اور رسول خدا کے ساتھ اس کی فدا کارانہ محبت، والہانہ عشق اور بے پایاں شوق کے تذکرہ سے اپنے نہاں خانۂ دل میں نور و تابندگی بخشیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اقبال کا فکری پس منظر اور اس کے تصوّرات کا اجمالی خاکہ بھی سامنے لایا جائے تاکہ اس "کافر ہندی" کے ذوق و شوق کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

کافر ہندی ہوں میں دیکھ میرا ذوق و شوق

دل میں صلوٰۃ و درود، لب پہ صلوٰۃ و درود

اقبال کی شخصیت بڑی دل آویز، ہمہ گیر، جاذب نظر اور پُرسوز و پُرکشش ہے اور وہ ایک ایسا بے پایاں سمندر ہے جس میں زندگی کے مختلف دھارے آکر ملتے ہیں اور اقبال اُن سب کو اپنے دامن میں سمیٹے سرمستی و سرخوشی کے ساتھ نغمہ خواں ہے، اس کے ذہن میں بلا کی وسعت اور ہمہ گیری ہے اس کے کلام پر جتنا غور کیجئے نت نئے معانی اور زندگی کے اسرار کھلتے نظر آئیں گے، معانی کا یہ سیل بے پایاں اور فکر و نظر کی یہ وسعت ہمیں ایک ایسے نقطہ اور سرچشمہ پر ضرور پہنچاتی ہے جہاں سے اقبال کی زندگی کے یہ سارے سوتے پھوٹتے ہیں اور جن سے اس کے فکر و نظر کی

آبیاری ہوتی ہے اور وہ ہے ؎

نقطۂ پرکارِ حق مردِ خدا کا یقیں

اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

یہ مردِ خدا اقبال کا وہی "مردِ مومن" ہے جو عہدِ جدید کے "انسان" کا ایک مثالی کردار ہے اور یہ ایک ایسا جاندار کردار ہے جو ہمیشہ زندہ رہیگا یہ مثالی کردار، خدا، رسالت اور آخرت کے یقین اور اسلام کے نظامِ حیات کے تفصیلی علم و ادراک کے بعد عالمِ وجود میں آتا ہے۔ اِسی لئے اقبال کا یہ مردِ مومن اپنے اندر ایک جلال و جمال رکھتا ہے۔ اس کی اذانوں سے حضرت موسیٰ کلیم اللہ اور ابراہیم خلیل اللہ کے اسرار فاش ہیں اس کا ہاتھ دراصل اللہ کا ہاتھ ہے اس لئے وہ غالب، کارآفریں، کارکشا اور کارساز ہے۔ مردِ مومن کی امیدیں نہایت قلیل ہوتی ہیں اور اس کے مقاصد دعزائم اعلیٰ اور جلیل ہوتے ہیں اس کی ادا دلفریب اور اس کی نگہ دلنواز ہوتی ہے' ایسے ہی مردِ مومن کی نگاہوں نے مشرق و مغرب کی تربیت کی اور اُن کے فکر و نظر نے یورپ کے ظلمت کدوں میں عقل و خرد کے روشن چراغ جلائے، اقبال کے مردِ مومن کے یہ صفات دراصل قرآنی فکر کا وہ مثالی انسانی کردار ہے، جو خدا' نبوت اور آخرت کے تصور سے پیدا ہوتا ہے۔

اقبال کے علوم و حکمت کا یہی وہ قرآنی سرچشمہ ہے، جس سے زندگی کے سوتے پھوٹے ہیں اور آج بھی اندھیری شب میں بھٹکتے ہوئے راہی اسی آفتاب ہدایت سے کسب نور کر سکتے ہیں اور اپنے ظلمت کدوں کو روشن و تابناک بنا سکتے ہیں۔

اقبال کا یہی وہ قرآنی تصور حیات ہے جس نے "نگاہ شاعر رنگیں نوا" میں جادو بھر دیا ہے، جس سے ساری دنیا مسحور ہے، چنانچہ فرماتے ہیں ؎

داستان کہنہ شستی باب باب
فکر را روشن کن از ام الکتاب
جز بقرآں ضیغمی روباہی است
فقر قرآں اصل شاہنشاہی است
نقش قرآں تا دریں عالم نشست
نقش ہائے کاہن و پاپا شکست
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

جس عظیم شاعر نے اپنے فکر کی آبیاری قرآن جیسی زندہ جاوید کتاب سے کی ہو اس کا صاحب کتاب کے ساتھ والہانہ عشق و محبت کا کیا پوچھنا؟ کس یقین کے ساتھ فرماتے ہیں ؎

دل بہ سلمائے عرب باید سپرد
تا دمد، صبح حجاز از شام کرد

جس نے اپنے آپ کو "سلمائے عرب" رسول اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کر دیا تو اس کی "شام" پر حجاز کی صبح سعادت نمودار ہوگی اسلئے کہ

ہست دین مصطفٰے دین حیات
شرع او تفسیر آئین حیات

دین مصطفٰے زندگی کا نظام ہے اس کی شریعت آئین حیات کی ایک مرتب تفسیر ہے۔

کائنات کی تخلیق کے ساتھ ہی انسانیت کی ہدایت و رہنمائی کیلئے خدا نے انبیاء کا ایک سلسلہ بھی شروع کیا، جو حق و صداقت کی مشعل لئے یقین و اذعان کا چراغ جلائے، زندگی کے ہر تاریک موڑ پر اجالا کرتے اور گم کردہ راہ انسانیت کو راہ ہدایت پر گامزن کرتے رہے، نبوت و رسالت کی یہ ضرورت انسانیت کی لازمی ضرورت تھی، رسالت کے بغیر کارجہاں ناتمام رہتا، اور انسان انسانیت سے بیگانہ ہوتا، رسول کے بغیر آئین حیات غیر مرتب اور ناقص ہوتا، انسانیت کے جسد مردہ میں رسالت نے روح زندگی پھونکی۔

حق تعالےٰ پیکر ما آفرید
وز رسالت در تن ما جاں دمید

از رسالت در جہاں تکوین ما
از رسالت دین ما آئین ما

اس سلسلۂ رسالت کی آخری کڑی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ آپ کی بعثت کے بعد یہ سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا اس لئے کہ یہ دین مصطفےٰ ایک ایسا آخری نظام حیات ہے جو تمام عالم کو ایک وحدت عطا کرتا ہے، آپ نے انسانیت کو ایک خدا، ایک انسان، ایک نظام کا عظیم تصور دیا جس نے بکھری ہوئی انسانیت کو ایک لڑی میں پرو دیا اس طرح آپ نے زندگی کا ایک ایسا جامع نظام عطا کیا جو زندگی کے سارے شعبوں کی تکمیل کرتا ہے، یہ تکمیل دین دراصل تکمیل رسالت ہی ہے اقبال کس والہانہ انداز میں اس حقیقت کا اظہار کرتے ہیں ؎

دین فطرت از نبی آموختیم
در رہ حق مشعلے افروختیم
پس خدا بر ما شریعت ختم کرد
بر رسول ما رسالت ختم کرد
لا نبی بعدی ز احسان خداست
پردۂ ناموس دین مصطفےٰ است

یہ انسانیت جو عرصہ سے نور نبوت سے محروم اندھیرے میں

بھٹکتی پھر رہی تھی، اور یہ کائنات اس خزاں رسیدہ چمن کی مانند ہو گئی تھی
جس پر مدت سے بہار نہ آئی ہو، ایسی حالت میں آنحضرتؐ کی ذات اقدس
اس مردہ کائنات پر ابر رحمت بن کر برسی، جس سے انسانیت کی یہ خزاں رسیدہ
کھیتی سرسبز و شاداب ہوئی اور حیات کے ظلمت کدہ میں روشنی پھیلی،
اقبال جس نے نور نبوت سے کسب نور کیا تھا، جس کی آنکھیں خاک یثرب سے
روشن اور جس کا دل چراغ مصطفوی سے فروزاں تھا وہ اس حقیقت سے
اچھی طرح آشنا تھا اور خوب سمجھتا تھا کہ اپنے آپ کو آنحضرتؐ کے قدموں پر
ڈال دینا ہی حقیقت دین ہے ورنہ چراغ مصطفوی سے دوری اصل
شرار بولہبی میں پہنچا ہے ؎

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

اقبال نے عشق رسول میں ایک بے چین اور سیماب وش طبعت
پائی تھی اور اُن کا قلب حبّ رسول میں اس قدر سرشار اور سوز و گداز سے
اس قدر بھرپور تھا کہ جب کبھی آنحضرت کا ذکر خیر ان کی مجلس میں ہوتا تو
اقبال تڑپ جاتے، مدینہ کی یاد انہیں ستاتی اور آنکھوں سے اشکوں کا
ایک سیل رواں ہو جاتا، دربار نبیؐ سے دوری، اُن کے نزدیک قسمت کی
سب سے بڑی محرومی تھی ؎

حیف او محروم دربار نبیؐ
چشم من روشن ز دیدار نبیؐ

راہ یثرب کی بادیہ پیمائی اُن کی آخری زندگی کی سب سے بڑی تمنا تھی
چنانچہ عشق رسول کے سرور میں نواخواں ہیں ؎

بایں پیری رہ یثرب گرفتم
نواخواں از سرور عاشقانہ

منازل عشق طے کرنے اور اپنے اندر صفات مرد مومن پیدا
کرنے کے لئے عشق رسول میں سرشار رہنا لازمی ہے اور اسی سے حقیقی
اتباع نبوی ممکن ہے۔ آنحضرت کی سیرت اور آپ کا اسوۂ حسنہ ایک
روشن شاہراہ کی طرح ہمارے سامنے موجود ہے جس نے بھی اُس
شاہراہ حیات پر قدم بڑھایا کامیاب و کامران رہا ؎

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبار راہ کو بخشا، فروغ وادیٔ سینا

یہی وجہ ہے کہ اقبال نے اتباع نبوی پر بہت زور دیا ہے خصوصاً
ان لوگوں سے جو شریعت کے اسرار و رموز سے ناواقف ہیں، جو بجائے
آئین شریعت سے شکوہ سنج ہیں، اُنہیں خاص طور پر حدود مصطفوی میں
رہنے کی نصیحت کی ہے ؎

شکوہ سنجِ سختیٔ آئیں مشو
از حدودِ مصطفیٰ بیروں مرو

پھر کہتے ہیں ؎

از پیام مصطفیٰ آگاہ شو
فارغ از اربابِ دون اللہ شو

آئینِ شریعت سے شکوہ سنجی صحیح نہیں ہے، اس لیئے ضروری ہے کہ پیام مصطفیٰ سے آگاہی ہو، پیام مصطفوی سے آگاہی ہی دنیا کے سینکڑوں خداوندان باطل اور ارباب من دون اللہ سے نجات بخش سکتی ہے ؎

ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

حقیقت یہ ہے کہ ایک مرد مومن کے دل میں پیام مصطفیٰ سے واقفیت کے بعد ہی حقیقی مقام مصطفیٰ (صلے اللہ علیہ وسلم) پیدا ہو سکتا ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہماری آبرو ہی آپ کی ذات اقدس سے وابستہ ہے

در دلِ مسلم مقام مصطفیٰ است
آبروئے ما ز نام مصطفیٰ است

آپ نے اپنی امت کے لئے کیا کچھ کیا؟ اور آپ کی رحمۃ اللعلمینی بنی نوع انسان کے ساتھ کس دلسوزی و جانکاہی اور ہمدردی سے پیش آئی

اس کا مختصر خاکہ عشقِ رسول کے پیام پر اقبال ہی کی زبانی سنئے ؎

بوریا ممنونِ خوابِ راحتش
تاجِ کسریٰ زیرِ پائے امتش
در شبستانِ حرا خلوت گزید
قوم و آئین و حکومت آفرید
ماند شبہا چشمِ او محرومِ نوم
تا بہ تختِ خسروی خوابیدہ قوم
وقتِ ہیجا تیغِ او آہن گداز
دیدۂ او اشکبار اندر نماز
در جہاں آئینِ نو آغاز کرد
مسندِ اقوامِ پیشیں در نورد
از کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد
ہمچو او بطنِ امِ گیتی نزاد

تاریخ کے صفحات شاہد ہیں کہ آپ کی زندگی بوریئے پر گذری تاکہ قیصر و کسریٰ کا تاج آپ کی امتوں کے قدموں پر آجائے خود غارِ حرا میں خلوت گزیں ہوئے تاکہ تمہیں آئین و حکومت سے سرفراز فرمائیں۔ آپ کی راتیں شب بیداری اور طاعت الٰہی میں گذریں تاکہ آپ کی امت تختِ خسروی پر

سو سکے، مصائب کے وقت آپ کی آنکھیں نماز میں اشکبار رہیں تا کہ ہمیں فتح و کامرانی حاصل ہو۔ آپ ہی نے دنیا میں آئین نو کا آغاز کیا اور کلید دین سے باب دنیا کھولا، اور یہ دنیا آپ کی مانند پھر کوئی شخصیت پیدا نہ کر سکی۔ ایسی رحمت عالمؐ رسول اکرم کی ذات مبارک سے جتنا بھی اظہار محبت کیا جائے کم ہے اور اس کے ساتھ جتنی بھی وارفتگی و فداکاری سے کام لیا جائے تھوڑا ہے۔ آپ کی ذات بابرکت ایک مرد مومن کے لئے حقیقی ملجا و ماویٰ ہے، آپ کی محبت زندگی ہے اور کائنات کی ساری کامرانیوں کا راز عشق رسول ہی میں پنہاں ہے۔ اقبال کی والہانہ عشق کا اندازہ اُن کے اس شعر سے بھی ہوگا جو اپنے اندر محبت و عقیدت کی ایک دنیا سمیٹے ہوئے ہے ؎

خاک یثرب از دو عالم خوشتر است
اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

اقبال کے عشق رسول کا عالم یہ ہے کہ وہ اپنے خدا سے تمنا بھی کرتے ہیں تو اس بات کی کہ قیامت کے دن اُن کا نامۂ اعمال حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے پوشیدہ رہے تاکہ اُن کی نظروں میں ندامت و رسوائی نہ اُٹھانی پڑے ؎

مکن رسوا حضور خواجہ مارا | حساب من زچشم او نہاں گیر

سچ تو یہ ہے کہ اقبال کے عشق بے پایاں کا اندازہ بڑا ہی مشکل ہے، اُن کا آخری مجموعہ کلام "ارمغان حجاز" ایک ایسا پیام محبت ہے، جس میں عشق کی سوزش، اس کی سرخوشی و سرمستی، آہ و نالہ سوز و ساز، تب و تاب اور درد و داغ سب کچھ پنہاں ہے۔ اس سلسلہ میں کلام اقبال کی کہاں تک توضیح و تشریح سے کام لیا جائے؟ بلکہ حق تو یہ ہے کہ ترجمہ سے شعر کی حسن و خوبی اور اس کی ساری کیفیت بے مزہ ہو کر رہ جاتی ہے، اس لئے مناسب یہ ہے کہ اقبال ہی کی زبان عشق و محبت کے چند کیف آگیں نغموں سے اپنے دلوں میں سرور و شوق پیدا کیجئے

بیا اے ہم نفس باہم بنالیم　　من و تو کشتۂ شان جمالیم
دو حرفے بر مراد دل بگوییم　　بپائے خواجہ چشماں را بمالیم

گہے شعر عراقی را بخوانم　　گہے جامی زند آتش بجانم
ندانم گرچہ آہنگ عرب را　　شریک نغمہ ہائے ساربانم

مسلماں آں فقیرے کج کلاہے　　رمید از سینۂ او سوز آہے
دلش نالد! چرا نالد؟ نداند　　نگاہے یا رسول اللہ نگاہے

مرا تنہائی و آہ و فغاں بہ — سوئے یثرب سفر بے کارواں بہ
کجا مکتب، کجا میخانۂ شوق — تو خود فرما مرا ایں بہ کہ آں بہ

زبانِ ما غریباں از نگاہیست — حدیث دردمنداں اشک و آہیست
کشادم چشم و بربستم لب خویش — سخن اندر طریق ما گناہیست

مرا ایں سوز از فیض دم تست — بتاکم موج مے از زمزم تست
خجل ملک جم از درویشیٔ من — کہ دل در سینۂ من محرم تست

اقبال کے گلدستۂ محبت سے جو انھوں نے بارگاہ رسالت میں پیش کئے ہیں یہ صرف چند پھول ہیں جو میں نے آپ کے سامنے رکھے ہیں، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ شمع رسالت کا یہ پروانہ اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک عشق رسول کے سوز میں جلتا رہا اور اپنے زبان وقلم سے عقیدت ومحبت کے پھول نچھاور کرتا رہا اور آخر میں یہ کہہ کر اپنے رب کے حضور میں جا پہنچا ؎

سرورِ رفتہ باز آید کہ ناید — نسیمے از حجاز آید کہ ناید
سر آمد روزگارِ ایں فقیرے — دگر دانائے راز آید کہ ناید

"انسانِ کامل" اقبال کی نگاہ میں

اقبال کی نگاہِ متجسس کو اِس عالمِ رنگ و بو میں جو اپنے اندر گوناگوں دلفریبیاں اور دلچسپیاں رکھتی ہے، صرف درندوں کا بھٹ اور چوپایوں کا جنگل نظر آیا اور اس کی متجسسانہ نگاہیں اس درندوں اور چوپایوں کی دنیا میں کسی "انسان" کی جویا رہیں۔ اپنے اس تلاش و جستجو کی ابتدا اپنی مشہور کتاب "اسرارِ خودی" میں مولانا جلال الدین رومی کے اِن اشعار سے کی ہے ؎

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر
کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست
زیں ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت
شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

کیا دیکھتا ہوں کہ ایک اندھیری رات ہے اور ایک درویش سِن رسیدہ

ہاتھ میں مشعل لئے کوچہ و بازار کی خاک چھانتا پھرتا ہے، جیسے اسکی نگاہ کسی گمشدہ کی تلاش میں ہو، میں نے کہا حضرت سلامت کس چیز کی تلاش ہے؟ فرمانے لگے ان درندوں اور چوپایوں کی بستی میں رہتے رہتے طبیعت عاجز آگئی ہے، اب اس وسیع کائنات میں کسی "انسان" کی تلاش کو نکلا ہوں، ایک ایسا نوجوان جس کی مردانگی اور شخصیت میری روح کو تسکین اور بالیدگی عطا کرسکے۔ میں نے کہا آپ کس دھوکے میں ہیں؟ یہ تو عنقا کی تلاش ہے۔ اس کے پیچھے اپنے آپ کو کیوں مشقت میں ڈالتے ہیں؟ میں نے اس راہ میں دردر کی خاک چھانی ہے، دشت وصحرا، آبادی و ویرانہ کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں میرے قدم نہ پہنچے ہوں مگر اس کی حقیقت تو کیا پرچھائیں بھی نظر نہ آئی، درویش نے کہا مجھے تو اس شے کی تلاش وجستجو زیادہ محبوب ہے جس کا وجود نادر اور جس کا حصول آسان نہ ہو ــــــ!

سوال یہ ہے کہ علامہ اقبال نے اس "گمشدہ انسان" کو اس وسیع کائنات میں پالیا یا حیران وسرگرداں بھٹکتے پھرے؟ اقبال کے کلام کا مطالعہ اس حقیقت کی طرف اچھی نشاندہی کرتا ہے بیک نظر اور بلا خوف تردید ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہاں اقبال نے اس کھوئے ہوئے انسان کو پالیا اور نہ صرف پایا بلکہ اس کو اچھی طرح پہچانا

اور زندگی کے طویل ایام اس کے ساتھ گذارے۔ اقبال کا یہ اکتشاف کولمبس کی نئی دنیا کے اکتشاف سے زیادہ وقیع اور بڑا اکتشاف ہے اور بلاشبہ ایک فتح عظیم ہے۔ اس لئے کہ کھوئے ہوئے انسان کی تلاش وجستجو اور پھر اس میں کامیابی اس عالم کی سب سے بڑی خوش بختی اور سب سے بڑی بازیافت ہے، خصوصًا اس دور میں جب کہ "انسان" کھو چکا ہو اور انسانیت افسانہ بن چکی ہو۔

اقبال کا وہ گمشدہ انسان جسے وہ "انسان کامل" سے تعبیر کرتا ہے کہاں ہے؟ اور کون ہے؟ مجھے یہ ڈر ہے کہ ہم میں سے اکثر اس سوال کا جواب سن کر چونک پڑیں گے جب کہ اُن کے سامنے یہ حقیقت آئے گی کہ اقبال کا "انسان کامل" ایک سچا مسلم ہے اور اُن کا یہ چونکنا بڑی حد تک بجا ہے کیونکہ وہ لوگ جن کی نگاہوں کے سامنے لفظ "مسلم" کے بعد ایک خشک جامد اور بجھی بجھی زندگی گذارنے والے انسان کی تصویر پھر جاتی ہے [illegible] کبھی بھی اقبال کے انسان کامل کا تصور کسی "مسلم" سے نہیں کر سکتے [illegible] اقبال کا مرد مومن دراصل قرآنی [illegible] انسان کامل [illegible]

اقبال کے اس مرد مومن [illegible]

قوت اور یقین کی ناقابل تسخیر طاقت [illegible] سامنے [illegible] شک وریب میں مبتلا ہیں [illegible] اور اسی طرح [illegible]

مقابلہ میں اپنی شجاعت و مردانگی اور روحانی قوت سے ممتاز ہے۔ ایک مسلم کی توحید خالص اُسے بندۂ انسان اور بندۂ مال وزر سے علیحدہ کردیتی ہے اس کی آفاقیت وانسانیت، وطن پرستی، قوم پرستی اور رنگ ونسل کے امتیاز کی جڑ کاٹ دیتی ہے۔ وہ مسلم مثالی زندگی کا ایک پیام رکھتا ہے، جس کے ماتحت وہ زندگی گذارتا ہے۔ زندگی کی قدریں خواہ بدل جائیں اور انسانی زندگی میں کتنا بڑا ہی انقلاب کیوں نہ آجائے لیکن اس کے اندر نہ کوئی تبدیلی ہوتی ہے اور نہ وہ خود اپنے آپ کو بدلتا ہے۔ اس مسلم کی مثال قرآن نے اپنے سادہ اور بلیغ لفظوں میں اس طرح بیان کی ہے کشجرۃ طیبۃٍ اصلھا ثابت وفرعھا فی السماءِ اس کی مثال ایسے پاک درخت کی ہے جس کی جڑیں جمی ہوں اور شاخیں دور تک پھیلی ہوئی ہوں، اقبال کہتا ہے ؎

نقطۂ پرکار حق مرد خدا کا یقین
اور یہ عالم تمام وہم وطلسم و مجاز

"انسان کامل" کے اس تصور سے ہمارے ذہنوں میں "مسلم" کی دو قسمیں آتی ہیں ایک اس کا وجود انسانی ہے دوسرا اس کا وجود ایمانی! اپنے وجود انسانی میں اُس میں اور دوسرے انسانوں میں اشتراک ہے، عام انسانوں کی طرح پیدا ہوتا ہے اور ویسے ہی پروان چڑھتا اور بڑا ہوتا ہے۔ ہر انسان کی طرح اُسے بھوک بھی لگتی ہے اور پیاس بھی!

اُسے گرمی کا بھی احساس ہوتا ہے اور سردی کا بھی، بیمار بھی پڑتا ہے اور صحت مند بھی ہوتا ہے، فقر وغنا میں بھی وہ عام انسانوں کے مثل ہے۔ زراعت وتجارت اور دوسرے انسانی شعبوں سے بھی اُسے دلچسپی ہے اولاد سے محبت کرتا ہے اور اپنے پہلو میں بھی دل رکھتا ہے، غرض کہ وہ اپنے وجود انسانی میں قانون طبعی کا ویسا ہی تابع ہے، جیسے اس کے مثل اور دوسرے انسان! انقلاب زمانہ اور حوادث روزگار اس کے ساتھ کوئی رعایت نہیں برت سکتے، محض اس لئے کہ اس کا کوئی خاص نام ہے اور اس کا تعلق کسی خاص نسل سے ہے یا وہ کوئی خاص قسم کا لباس پہنتا ہے بلکہ اس کا وجود اس وسیع کائنات میں صرف ایک ذرہ کی حیثیت رکھتا ہے اور عالم کے اس بحر ذخار میں اس کی مثال ایک موج کی ہے۔ اگر ایک مسلم بھی عام انسانوں کی طرح زندگی گذارنے پر اکتفا کرے تو پھر اس کی اس کائنات میں کوئی قدر وقیمت باقی نہیں رہتی اور اس کی موت پر نہ زمین روئے گی اور نہ آسمان ماتم کناں ہوگا اور اس دنیا کی نیرنگیوں میں کچھ بھی کمی واقع نہ ہوگی، لیکن اس کا وجود ایمانی اپنے اندر ایک پیام رکھتا ہے جو انبیاء کا پیام ہے۔ زندگی کے بارے میں اس کے کچھ مبادی اور اعتقادات ہیں، جن پر وہ ایمان رکھتا ہے اور اس کی زندگی ایک مقصد کے لئے گذرتی ہے اس حیثیت سے اگر غور کیا جائے تو وہ حیات انسانی کے اسرار

سربستہ کا ایک راز ہے، عالم کی بقا کے لئے اس کا وجود ایک لازمہ کی حیثیت رکھتا ہے، انسانی زندگی اس کے بغیر ادھوری ہے، لہٰذا وہ مردِ مومن اور مسلم مثالی اس بات کا مستحق ہے کہ اس کائنات میں زندگی گذارے، پھلے، پھولے اور پروان چڑھے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ کائنات کی بقا کے لئے اس کا وجود اور اس کا پھلنا پھولنا، پروان چڑھنا ضروری ہے، جس طرح اس کائنات کو پانی، ہوا اور روشنی کی ضرورت ہے اسی طرح اسے ایک مردِ مومن کی بھی ضرورت ہے اگر حیاتِ انسانی پانی، ہوا، روشنی اور حرارت و برودت کے وجود پر منحصر ہے تو اسی طرح ایک ایسے مقصدِ زندگی، روحِ ایمانی اور اخلاق کا وجود بھی ناگزیر ہے جس کی روشنی انبیاء علیہم السلام کی دعوت و پیام سے حاصل کی گئی ہو اور جس کا بوجھ ایک مردِ مومن کا دوشِ ناتواں اٹھائے ہوئے ہو اور اس کے قیام و بقا کے لئے اپنی زندگی کی ساری قوتوں اور توانائیوں کو لگا رکھا ہو، اس لئے کہ اگر مومن نہ ہو تو یہ پیامِ زندگی اور مقاصدِ بلند ضائع ہو جائیں گے اور ان کا وجود عالم میں ایک رازِ سربستہ بن کر رہ جائے گا۔ اِس مردِ مومن کا وجود و بقا اس عالم میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو حیثیت آفتابِ جہانتاب کی ہے اور ان روشن ستاروں کی جن سے نسلیں وراثتیں پیدا ہونگی

اور فنا ہوں گی، آبادیاں ویران ہوں گی اور ویرانے آباد، حکومتیں بنیں گی اور مٹیں گی، ایک تہذیب و تمدن کی جگہ دوسری تہذیب لے گی اور یہ سلسلہ برابر جاری رہے گا، لیکن اُس مسلم مثالی کا وجود ہمیشہ باقی رہے گا۔

اقبال کا مردِ مومن "زندہ جاوید" ہے، اس لئے کہ وہ اپنے پاس ایک زندہ جاوید پیام رکھتا ہے، اس کے سینے میں ایک زندہ جاوید امانت ہے اور اس کی زندگی ایک زندہ جاوید مقصد کے لئے گذرتی ہے ؎

مٹ نہیں سکتا کبھی مردِ مسلماں، کہ ہے
اس کی اذانوں سے فاش سرِ کلیم و خلیل

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ملت اسلامیہ کا ہر فرد ہمیشہ باقی رہے گا اور موت کبھی اُسے اپنی آغوش میں نہ لے گی بلکہ اس کی مثال اس بحرِ ذخار کی ہے جس کی گود میں موجیں اُٹھتی رہتی ہیں اور فنا ہوتی رہتی ہیں، حیاتِ انسانی کے اس سمندر میں بھی موجیں اٹھتی رہیں گی اور فنا ہوتی رہیں گی لیکن اس کی حقیقت ہمیشہ باقی رہے گی

اقبال کی نگاہ بلند ابھی یہاں پر رکتی نہیں بلکہ اسکی نگاہ کہیں اوپر پہنچتی ہے وہ کہتا ہے کہ اس وسیع کائنات کا مقصد وجود ہی صرف

مردِ مومن ہے۔ عالم کا وجود اس کے لئے ہے اور وہ صرف اللہ کے لئے!
علماء و محدثین کے نزدیک یہ حدیث نبوی لولاک لما خلقت الافلاک
کی صحت لفظاً اور روایتاً خواہ کیسی ہی ہو لیکن اس کی نگاہِ حقیقت بیں کچھ اور
دیکھتی ہے وہ قرآن کی روح اور اس کی حقیقت پر نظر رکھتا ہے، اس کے
سامنے ایک "مسلمان" اور اس کا بلند "پیغام" ہے۔ وسیع انسانی تاریخ پر
اس کی غائر نظر ہے، عالم کی قدروں اور اشیاء کی طبعیتوں کا اُسے خوب
اندازہ ہے۔ اس لئے یہ حقیقت اس پر اچھی طرح واضح ہے کہ یہ کائنات
اور اس کے سارے لوازمات صرف ایک سچے مسلمان کے لئے وجود میں
آئے ہیں۔ وہ اللہ کا اس سرزمین پر نائب اور خلیفہ ہے۔ اس کائنات کے
تمام خزانوں اور ساری چیزوں کا وہ وارث ہے ؎

عالم ہے فقط مومن جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے

اور اس عقیدہ و فکر کو عملاً بروئے کار لانے کے لئے اس پر مسلسل
جدوجہد اور کوشش واجب ہے۔

یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال کا یہ عقیدہ و ایمان تھا کہ ایک
مسلمان ہوا کے رخ پر نہیں چلتا بلکہ وہ اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ بہتے ہوئے
دھارے کا رخ پھیر دے، عالم کو اپنی راہ پر چلائے، تہذیب و تمدن اور

معاشرہ اور سماج کا رخ موڑ دے اور ساری انسانیت اس کے عمل و ارادہ کے تابع ہو جائے اس لئے کہ وہ اپنے پاس اس دکھی انسانیت کیلئے ایک زندہ پیام رکھتا ہے جو اس کے تمام دکھوں کا مداوا ہے اس کے پاس ایمان و یقین کی جیتی جاگتی طاقت ہے اس عالم کی رہنمائی کا وہی ذمہ دار ہے دنیا کی امامت و قیادت اسی کو زیب دیتی ہے۔ اس عالم میں وہ صاحب امر و نہی کی حیثیت رکھتا ہے، اگر زمانہ اُسے قبول نہ کرے، سماج اس کا مخالف ہو اور سیدھی راہوں سے ہٹا ہوا ہو تو پھر اس کے لئے یہ کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ وہ زمانے کے آگے ہتھیار ڈال دے اور اپنے آپ کو غلط سماج کے سپرد کر دے۔ بلکہ اس پر ضروری ہے کہ زمانہ کے خلاف علم بغاوت بلند کرے اور معاشرہ اور سماج سے جنگ کرے یہاں تک کہ کامیابی و کامرانی اس کے قدموں پر آ لگے۔ اقبال کے نزدیک "چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی" کا نظریۂ زندگی ایک مرد مومن کیلئے کسی طرح صحیح نہیں، وہ کہتا ہے

حدیث کم نظراں ہے "تو با زمانہ بساز"
زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

اقبال کا خیال ہے ایک مومن زندگی کی غلط قدروں کے ساتھ مصالحت نہیں کرتا بلکہ وہ زندگی کے فاسد قدروں سے نبرد آزمائی کرتا،

اس کا کام حیات انسانی کی بگڑی ہوئی قدروں کی اصلاح ہے ۔ اور اس سلسلہ میں اُسے تخریب سے بھی کام لینا پڑے تو صحیح ہے اور یہ بر بنائے تعمیر و اصلاح ہوگا ، چنانچہ کہتا ہے۔

ہو صداقت کے لئے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکر خاکی میں جاں پیدا کرے
پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

اقبال کے نزدیک حالات و مصائب اور حوادث کے سامنے سر جھکا دینا اور قضا و قدر کا عذر پیش کرنا ایک مردِ مومن کا کام نہیں اس قسم کا عذر تو وہ لوگ پیش کرتے ہیں جو ضعیف الایمان اور کمزور عزم و ارادہ کے ہیں ۔ مردِ مومن خود تقدیرِ الٰہی ہے ۔

کافر ہے تو ہے تابع تقدیر مسلماں　　مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیرِ الٰہی

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

علامہ اقبال نے جب تاریخ عالم پر ایک نگاہ ڈالی تو انہیں نظر آیا کہ

صالح انقلاب ہمیشہ "مرد مومن" کا مرہون منت رہا ہے اور وہی اس کا سرچشمہ ہے اس کی مثال اس عالم کے مطلع پر ایک صبح سعادت کی سی ہے۔ وہ انقلاب کا قاید اور زندگی کا پیغامبر ہے۔ زندگی کی تاریک راتوں کے لئے گویا وہ صبح صادق کا موذن ہے اور اس کی اذان کی آواز عالم کے اس سکوت کو توڑ دیتی ہے، جو اپنے اندر رات کی سی خوفناک خاموشی اور موت کا سا بھیانک سکون رکھتا ہے اور پھر وہ اذان اس تھکی ہاری نیند کی ماری دنیا کو ایک نشاط اور زندگی بخشتی ہے۔ یہ وہی اذان اور بلند پکار ہے جو آج سے تیرہ سو برس پہلے فاران کی چوٹیوں سے بلند ہوئی جس نے اس وسیع کائنات کو ایک گہری نیند سے بیدار کیا جو کہ صدیوں سے مدہوش پڑی تھی اور یہ اذان مردہ انسانیت اور پریشاں حال دنیا کے لئے ایک صور قیامت ثابت ہوئی اور آج بھی اس اذان میں انسانیت کو جگانے اور ضمیر انسانی کو زندہ کرنے کی وہی قوت طاقت موجود ہے، ضرورت صرف اس مرد مومن کی ہے جو اس روح بلالی سے پکار دے ؎

دنیا کی عشا ہو جس سے اشراق

مومن کی اذان ندائے آفاق

اور ایک مرد مومن کی اذان ہی اس سحر کو نمودار کرے گی جس سے ایک عالم نو انگڑائی لیتا ہوا اٹھ کھڑا ہوگا ؎

یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی ہے امروز　　نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وجود ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

علامہ اقبال اس بات پر بھی یقین رکھتے تھے کہ ایک مردِ مومن کی طاقت و قوت، خرقِ عادت کی حیثیت رکھتی ہے، اس کی طاقت کے سامنے عقلِ انسانی حیران ہے بلکہ وہ انسان کے لئے ایک معجزہ سے کم نہیں، وہ اپنے پیغام اور اپنے ایمان و یقین سے اپنے اندر ایک نئی قوت و توانائی حاصل کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت، قدرت اور قوتِ قاہرہ ہمیشہ اس کے ساتھ رہتی ہے، اس کے بڑھتے ہوئے قدموں کو نہ تو پہاڑ روک سکتا ہے اور نہ سمندر اس کی راہ میں حائل ہو سکتا ہے۔ اقبال ایسے ہی مردِ مومن کے متعلق کہتا ہے۔

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں کارکشا کارساز
خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز

اسلامی قاید، فاتح اندلس طارق ابن زیاد اندلس کے میدانِ جنگ میں اپنے پروردگارِ حقیقی کے حضور میں اسلامی فوج کے لئے دعا گو ہیں، یہ مجاہدینِ اسلام اقبال کے مردِ مومن کی زندہ تصویریں ہیں۔

یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے جنھیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی

دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو
عجب چیز ہے لذت آشنائی
شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

کیا تو نے صحرا نشینوں کو یکتا
خبر میں، نظر میں، اذان سحر میں
طلب جس کی صدیوں سے تھی زندگی کو
وہ سوز اس نے پایا انہیں کے جگر میں

اور صرف یہیں تک نہیں بلکہ اقبال کی نگاہ دور رس مرد مومن کے پوشیدہ طاقتوں کا ذرا اور گہرائی سے اندازہ کرتی ہے، پھر کہتا ہے

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا
نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اقبال کے اس قول پر تاریخ عالم کے صفحات شاہد ہیں اور بلا شبہ مومن صادق کی مٹھی بھر جماعت نے دشت و دریا، کوہ اور سمندر ہر جگہ

اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں اور قدموں سے روند ڈالا اور آگے ہی بڑھتے چلے گئے ۔ اسلامی شہسواروں کے واقعات آج بھی تاریخ کے صفحوں پر ابھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سعد ابن ابی وقاص، خالد ابن ولید مثنیٰ ابن حارثہ، عقبہ ابن عامر، محمد ابن قاسم، موسیٰ ابن نصیر اور طارق ابن زیاد کے زندہ جاوید کارنامے تاریخ عالم کے مطلع پر ہمیشہ روشن رہیں گے اور یہ اقبال کے قول کی سچی اور عملی تصویریں ہیں ۔

اقبال کے نزدیک عالم میں ایک "مسلم" کی حیثیت ایک عالمی حقیقت کی ہے، رنگ و نسل اور وطن و ملک کی جغرافیائی حدود میں اسے پابند نہیں کیا جا سکتا وہ مکان و زمان کی حدود سے متجاوز ہے ۔ علامہ اقبال نے اس حقیقت کو اپنے خاص انداز میں یوں ادا کیا ہے

اس کی زمیں بے حدود اس کا افق بے ثغور
اس کے سمندر کی موج دجلہ و دینوب و نیل
اس کے زمانے عجیب اس کے فسانے غریب
عہد کہن کو دیا اس نے پیام رحیل
ساقی ارباب ذوق فارس میدان شوق
بادہ ہے اس کا رحیق، تیغ ہے اس کی اصیل

اقبال کو اس بات پر یقین تھا کہ ایک "مسلم ربانی" کا کوئی محدود وطن نہیں ہے بلکہ سارا عالم اس کا ملک و وطن ہے اس کے مشرق و مغرب کی کوئی تقسیم نہیں ہے

درویش خدامست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند

مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے
مومن کا مقام ہر کہیں ہے

اقبال کا یہ خیال تھا کہ چونکہ ساری کائنات خدا کی ہے اور ایک 'مومن' صرف خدا کا ہے اس لئے یہ ساری دنیا مرد مومن کا اپنا وطن ہے اس سلسلہ میں طارق ابن زیاد کے اس زریں واقعہ کو جب کہ اس نے اندلس کی سرسبز و شاداب زمین پر قدم رکھا تو اُن کشتیوں کو جن پر کہ وہ آیا تھا جلا دینے کا حکم دیا تاکہ پھر واپسی کا کوئی سوال ہی باقی نہ رہے فوج کے کچھ لوگوں کو طارق کی یہ حرکت پسند نہ آئی انہوں نے کہا کہ آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟ ہمارا وطن یہاں سے دور ہے اور ہمیں آخر واپس بھی ہونا ہے؟ اس کے جواب میں طارق کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل گئی، اُس نے تلوار اپنے ہاتھوں میں لی اور کہا کہ اب واپسی کا کیا سوال؟

ہر ملک ہمارا ہی ملک ہے، اس لئے کہ یہ ساری کائنات ہمارے خدا کی ہے اور ہم خدا کے ہیں، اقبال کی شاعرانہ جولانی اِس واقعہ کو اس طرح بیان کرتی ہے۔

طارق چو بر کنارہ اُندلس سفینہ سوخت
گفتند کار تو بہ نگاہ خرد خطا است
دوریم از سواد وطن باز چوں رسیم
ترک سبب ز روئے شریعت کجا روا است
خندید و دست خویش بہ شمشیر برد و گفت
ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ماست

ایک "مرد مومن" مختلف اور متضاد اخلاق و صفات کا حامل ہوتا ہے، جو اس کی طبعی رنگا رنگی اور تنوع پسندی کی آئینہ دار ہوتی ہے اور وہ مختلف و متضاد صفات در اصل اللہ تعالیٰ کے صفات و احوال کے مظاہر ہیں اور ایک "مسلم" اللہ تعالےٰ کے اُن صفات کا مظہر ہوتا ہے مثلاً کشادہ قلبی، عفو و درگذر اور حلم و بردباری وہ خدا کی صفت "غفار" کا پرتو ہے۔ اور اسی طرح دین وحق کے بارے میں شدت، کفر و باطل پر غصہ و غضب اس کی صفت "قہار" کا مظہر ہے اور پاکی و پاکدامنی، پاک نفسی صفت "قدوس" کی آئینہ دار ہے۔

ایک مسلمان اپنے دین کا ہو بہو نمونہ اور اسلام کی سچی تصویر اس وقت تک نہیں بن سکتا جب تک کہ اِن تمام اخلاق و صفات کا اپنے آپ کو پر تو نہ بنالے ؎

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

اقبال کہتا ہے ایسے ہی مردِ مومن کی مثال اُس روشن آفتاب کی سی ہے جس کے لئے غروب نہیں جو ہمیشہ طلوع ہی رہتا ہے۔ اگر ایک طرف غروب ہوا تو دوسری جانب طلوع ہوا ؎

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

اور یہ بات یقیناً سچ ہے تاریخ کے صفحات اس بات پر شاہد ہیں کہ جب کبھی عالمِ اسلام کے کسی حصّہ پر مسلمانوں ہی کی کمزوریوں کے باعث کوئی افتاد پڑی تو فوراً ہی اس کی تلافی کسی دوسرے حصّہ میں ہوگئی، اگر اسلام کو عالم کے ایک حصہ میں کچھ نقصان پہنچا تو دوسرے حصہ میں اسے ایک بڑی فتح حاصل ہوئی، اسلام کا اگر ایک ستارہ گردش میں آیا تو مطلع عالم پر ایک "نیا ستارہ" نمودار ہوا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اندلس کا خاتمہ ملّت اسلامیہ کے لئے ایک

اندوہناک واقعہ اور عظیم حادثہ تھا لیکن ساتھ ہی یورپ کے قلب پر حکومت ترکیہ کی ایک نئی اسلامی حکومت نمودار ہوئی، غرناطہ کا سقوط اور دولت عثمانیہ کا عروج یہ دو واقعے ہیں جو ایک ہی زمانہ میں واقع ہوئے تاتاریوں کے ہاتھوں بغداد کی تباہی بھی تاریخ اسلام کا بڑا افسوسناک حادثہ ہے لیکن اسی زمانہ میں ہندوستان کی مسلم حکومت نے ترقی و وسعت اختیار کی اور اس انیسویں صدی کے شروع میں یورپ کے ہاتھوں عالم اسلامی کو سخت چرکے لگے اور یورپ کی حکومتوں نے حکومت ترکیہ کو وراثت کے طور پر تقسیم کر لیا، لیکن ساتھ ہی سارا عالم اسلام جیسے جاگ اٹھا، ذہنی بیداری عام ہوئی، آزادی و حریت کا سیاسی شعور پیدا ہوا اور مختلف اسلامی تحریکیں چل پڑیں، آج ایسا نظر آرہا ہے کہ جیسے سارا عالم اسلام ایک نئی کروٹ لینے کو ہے دیکھئے پردۂ غیب میں کیا پوشیدہ ہے؟ "تاریخ اسلامی ایسے ہی واقعات سے بھری پڑی ہے۔ اسلام کا آفتاب اگر ایک افق میں چھپتا ہے تو دوسرے افق سے اس کی تیز کرنیں نمودار ہوتی ہیں اور یہ اس لئے کہ اسلام ہی اللہ کا وہ آخری پیغام ہے جو ساری انسانیت کے لئے شمع ہدایت ہے۔ اس کے بعد اس عالم کے لئے اب کوئی دوسرا پیام نہیں، اور مسلمان اس "پیغام" کی حامل آخری امت ہے،

اگر یہ ہلاک اور ضائع ہو گئے تو پھر وہ آخری پیغام ضائع ہو جائے گا اور انسانیت کی کشتی ہمیشہ کے لئے ڈوب جائے گی۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام کا وجود اس کائنات میں کفر و باطل کیلئے ہمیشہ ایک "خطرہ" رہا کیا ہے۔ اور اسلام ہی وہ واحد نظام زندگی ہے، جس کی بقا سارے باطل نظامہائے حیات کے لئے پیام موت ہے کافرانہ نظام زندگی اور ابلیس کی خدائی اسی وقت تک جاری ہے جب تک کہ اسلامی نظام حیات ابھر کر سامنے نہیں آجاتا اور "مردمومن" کا کوئی گروہ اس دنیا میں موجود نہ ہو لیکن جس دن یہ اُمت بیدار ہوئی، جس کی خاکستر میں "شرار آرزو" پوشیدہ ہے تو پھر ابلیس کی خدائی اور کافرانہ نظام حیات نقش بر آب ثابت ہو گا علامہ اقبال نے اپنی بے مثال نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں اس حقیقت کی اچھی نشاندہی کی ہے۔ انہوں نے تمثیلی انداز میں یہ بات واضح کی ہے کہ آج ابلیسی نظام کو سارا خطرہ و خوف "اسلام" ہی سے ہے۔ ابلیس کہتا ہے کہ اسلام کا آئین چشم عالم سے پوشیدہ رہے تو اچھا ہے کیونکہ اسی میں ہماری بقا ہے اور بسا غنیمت ہے کہ آج خود مومن محروم یقیں ہے اور پھر اپنے ساتھیوں کو مشورہ دیتا ہے کہ اچھا ہے انہیں الہیات اور علم کلام کے

مباحث میں الجھائے رکھو تاکہ بساطِ زندگی میں ان کے تمام مہرے مات ہوں اور اسی میں تمہاری خیر ہے کہ اس جہان پر اوروں کا قبضہ رہے اور مومن قیامت تک غلام رہے، کیونکہ ؎

ہر نفس ڈرتا ہوں اس اُمت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب کائنات

اقبال کی یہ تمثیلی نظم ابلیس کی زبان میں اس حقیقت کی اچھی طرح پردہ کشائی کرتا ہے کہ اِس عالم میں "مسلمان" ہی کا وجود کفر و باطل کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے اور اس کائنات میں پھیلے ہوئے ابلیسی نظام کو اگر کوئی خوف و خطر ہے تو وہ صرف اسلام سے ہے۔

اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ باطل پرستوں اور ابلیس کے کارندوں نے اپنی "مسلم دشمنی" کی اس مہم میں کامیابی حاصل کی اور یہ دراصل اسلام اور اس کی آنے والی نئی نسلوں کے خلاف ایک منظم سازش تھی۔ اِن کی سب سے بڑی کوشش یہی رہی کہ مسلمان نئی نسلوں کے سینوں میں ایمان و یقین کی جو چنگاریاں دبی پڑی ہیں اُنہیں جس طرح بھی ہو سکے بجھا دیا جائے اور عرب و عجم ہر جگہ اُن کی غیرت دینی اور جذبۂ اسلامی کو فنا کر دیا جائے کیونکہ یہی وہ جذبہ ہے جو ایک مسلمان کو ہر قسم کی قربانی اور جہاد فی سبیل اللہ کے لیے آمادہ کرتا ہے بڑے سے بڑے

مصائب میں بھی اس کے پائے استقامت میں لغزش نہیں ہوتی بلکہ نہایت خندہ پیشانی سے اس کا مقابلہ کرتا ہے۔ اقبال نے اپنی نظم "ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام" میں اس حقیقت کی طرف خوب نشاندہی کی ہے۔

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روح محمد اس کے بدن سے نکال دو
فکر عرب کو دے کے فرنگی تخیلات
اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو
افغانیوں کے غیرت دیں کا ہے یہ علاج
ملا کو اُن کے کوہ و دمن سے نکال دو

اس مقصد کے حصول کے لئے سب سے آسان اور بہتر راستہ ایسا نظام تعلیم جاری کرنا تھا جو مسلمان نوجوانوں کے دل و دماغ سے دینی روح، جذبۂ اسلامی اور فکر اسلامی کو یکسر ختم کر دے۔ اور ان میں ایسا مادی نقطۂ نظر پیدا کر دے جو انہیں مادی زندگی کا رسیا اور عارضی و فانی زندگی کا دلدادہ بنا دے، خود اعتمادی جاتی رہے اور شک و ریب میں مبتلا ہو جائے۔ اکبر مرحوم نے ایسے ہی نظام تعلیم کے متعلق کہا تھا ؎

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

اقبال کی نگاہ حقیقت شناس دیکھتی ہے کہ کفر و باطل اپنے مقصد میں کامیاب ہو رہا ہے، دینی شعور سارے عالم میں کمزور ہو چکا ہے، ایمان کی چنگاریاں بجھ چکی ہیں، روح جہاد ختم ہو چکی ہے، مادیت اور نفع پرستی کا دار دورہ ہے، چنانچہ وہ کہتا ہے۔

ذکر عرب کے سوز میں فکر عجم کے ساز میں
نے عربی مشاہدات نے عجمی تخیلات
قافلۂ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں،
گرچہ ہے تابدار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

اقبال کی طبیعت حساس کو جب مسلمانوں کی موجودہ زندگی کا احساس ہوتا ہے تو وہ بے چین ہو جاتا ہے اور خون کے آنسو اس کی آنکھوں سے رواں ہو جاتے ہیں۔ اور اس کی شاعری سے خون دل و جگر بہہ پڑتے ہیں۔ اور وہ توحید اسلامی کے اس وارث سے شکوہ سنج ہوتا ہے ۔

اے لاالہ کے وارث باقی نہیں ہے تجھ میں
گفتار دلبرانہ، کردار قاہرانہ

تیری نگاہ سے دل، سینوں میں کانپتے تھے
کھویا گیا ہے تیرا، جذبِ قلندرانہ

اسی قسم کا شکوہ اور دوسری جگہ بھی فرماتے ہیں ؎

وہ سجدہ روحِ زمیں جس سے کانپ جاتی تھی
اُسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب
سنی نہ مصر و فلسطیں میں وہ اذاں میں نے
دیا تھا جس نے پہاڑوں کو رعشۂ سیماب

تیرے محیط میں کہیں، گوہرِ زندگی نہیں
ڈھونڈ چکا میں موج موج دیکھ چکا صدف صدف

اقبال کے نزدیک ان تمام خرابیوں کا باعث مومن کا وہ قلب ہے جس سے ایمان خالی ہو چکا ہے اور زندگی کے شعلے بجھ چکے ہیں۔ کہتا ہے

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے
مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج، دل پریشاں، سجدہ بے ذوق
کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے

اقبال کی نگاہوں کے سامنے مسلمانوں کی موجودہ حالت کیفیت

عیاں ہے اور وہ اس حالتِ زار پر بے چین و پریشان اور شکوہ سنج بھی ہے لیکن چونکہ اقبال یاس و قنوط کا شاعر نہیں بلکہ امید و آس، یقین و ایمان کا "پیغام بر" ہے اس لئے وہ مایوس نہیں ہے، اُسے اس بات پر یقین ہے کہ عالم اسلام کو جو سیاسی تھپیڑے لگے ہیں اُس نے مسلمانوں کو بیدار کر دیا ہے اور اُن میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی ہے اپنی مشہور نظم "طلوعِ اسلام" میں وہ کہتا ہے ۔

دلیلِ صبحِ روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
اُفق سے آفتاب ابھرا گیا دورِ گراں خوابی
عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی
مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی
عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نطقِ اعرابی

ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں ؎

نہیں ہے ناامید اقبالؔ اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

اقبال کی نگاہیں یہ دیکھ رہی ہیں کہ مغربی تہذیب نے اپنا پارٹ اب ادا کر دیا ہے اس کی زندگی کے دن پورے ہو چکے ہیں، اُسکے چہرے سے ضعف و اضمحلال کے آثار نمایاں ہیں۔ اِس عالم میں اُس کا وجود اپنی آخری سانسیں لے رہا ہے۔ اُس کی مثال اُس پکے ہوئے پھل کی ہے جو عنقریب ٹوٹ کر گرنے والا ہو، اس کی جگہ اب ایک نئی تہذیب لینے والی ہے — یہ "عالمِ پیر" مر رہا ہے اور ایک "جہانِ نو" پیدا ہو رہا ہے مگر اقبال کو اس بات پر بھی یقین ہے کہ جب تک اس جہانِ نو کی امامت و قیادت "مردِ مومن" کے ہاتھوں میں نہیں آتی اس وقت تک یہ انسانیت اِن فرنگی مقامروں کے ہاتھوں ہلاکت و بربادی سے دوچار ہوتی ہی رہے گی۔ ضرورت ہے کہ "مردِ مومن" اُٹھے اور ایک "جہانِ نو" کے بانی کی حیثیت سے موجودہ بیمار انسانیت کے دکھوں کا مداوا بن کر اُسے ایک نئی زندگی اور توانائی عطا کرے۔

جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا وہ عالمِ پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ

اشتراکیت اور اقبال

اقبال ایک عظیم شاعر تھا ۔ اس کی شاعری اپنے اندر بڑی وسعت رکھتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ آج "شمع اقبال" کے ایک دو نہیں سیکڑوں پروانے نظر آتے ہیں، ان میں مختلف مکتب خیال اور فکر و نظر کے حضرات شامل ہیں اقبال کی ہمہ گیری ان سب کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اقبال کی شاعری اور فکر و نظر میں خود کوئی تضاد ہے اقبال کا ایک فکر ہے، اس کا ایک خیال ہے اور اس کے دل کا دیا اس ایک ہی چراغ سے روشن ہے جس کی ضیا پاشیاں سارے عالم کو منور کئے ہوئی ہیں ۔ یہ اور بات ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اپنے فکر و خیال کی تائید کیلئے اقبال کے صحیح فکر سے ہٹ کر اقبال کی شاعری کو استعمال کرنے کی ناکام کوشش کر رہا ہے یا پھر فکری تہی دامنی، کوتاہ نظری، اور غلط بینی میں مبتلا ہے ۔

علامہ اقبال کو ان کے اصل مقام سے ہٹا کر اپنی راہ پر چلانے والے کارواں کے "میر کارواں" ہمارے بعض ترقی پسند ادبا رہیں جنکی تمام تر کوشش

یہی رہتی ہے کہ اقبال کو ایک ترقی پسند اور اشتراکی شاعر ثابت کیا جائے اس سلسلہ میں علامہ اقبال کی مشہور نظم ؎

اُٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امراء کے در و دیوار ہلا دو

ان کے سارے دعوے کی دلیل رہتی ہے، ابھی کچھ دن ہوئے مشہور ترقی پسند ادیب عزیز احمد نے "اقبال کی ایک نئی تشکیل" کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے۔ اقبال کی یہ نئی تشکیل دراصل اسی قسم کی ایک عملی کوشش ہے جس کا مقصد اقبال کو صرف اشتراکی رنگ میں پیش کرنا ہے۔ اقبال کس قدر اشتراکی شاعر تھا؟ اس کا تفصیلی جائزہ تو ہم بعد میں لیں گے سب سے پہلے ہم یہ چاہتے ہیں کہ اقبال اور اس کی شاعری کا فکری تجزیہ کیا جائے تاکہ خود اقبال اپنے صحیح رنگ میں ابھر کر سامنے آسکے۔

اگر اقبال اور اس کی شاعری کا فکری تجزیہ کیا جائے تو اس کی تین قسمیں کرنی ہوں گی، اقبال کی ایک ابتدائی شاعری ہے جو وطنی شاعری کہی جاسکتی ہے۔ دوسری قومی شاعری، اور تیسری خالص اسلامی شاعری! اقبال کی فکری بلندی جوں جوں بڑھتی گئی، اس کی شاعری میں اسلامی رنگ نکھرتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ ایک دور وہ آیا جب کہ اقبال قرآن میں گم ہو چکا تھا، اس کی شاعری قرآن کی

آواز بازگشت بن گئی ، اس اخیر دور میں اقبال نے جو کچھ کہا ہے وہ قرآن کا پرتو تھا ، اس کی زندگی عشق رسول اور محبت الٰہی میں سرشار تھی ، اسکی فکر قرآن کی فکر بن گئی تھی اور وہ خود قرآن میں کھو چکا تھا اس کی زندہ مثال اقبال کے کلام کا آخری مجموعہ " ارمغانِ حجاز " ہے ۔

اردو ادب کے مشہور ترقی پسند نقاد پروفیسر آل احمد سرور نے اقبال کو " قوت و توانائی " کا شاعر کہا ہے ، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سرور صاحب اقبال کی شاعری اور اس کے فلسفہ پر بڑی گہری نظر رکھتے ہیں ، مگر پھر بھی وہ اقبال کے متعلق اس سے زیادہ اور کہہ بھی کیا سکتے ہیں ؟ سچ تو یہ ہے کہ قرآن کی حقیقی روح سے واقف ہوئے بغیر نہ کوئی اقبال کو سمجھ سکتا ہے اور نہ اس کی شاعری کی حقیقی روح کو قرآنی روح سے علیحدہ ہو کر اقبال کی شاعری کو " قوت و توانائی " ہی کی شاعری کہی جا سکتی ہے اور بس ! اقبال کی شاعری کو سمجھنے کے لئے نہ " تری ادبی نظر " کی ضرورت ہے اور نہ " مذہبی جنون " کی بلکہ دل روشن ضمیر بیدار اور قرآنی فکر و نظر درکار ہے ۔

اقبال کے کلام کو جب قرآن کے نقطۂ نظر اور اس کی روشنی میں مطالعہ کیا جائے تو پھر صحیح معنوں میں اس کے کلام کے زور اور زندگی کا پتہ چلے گا ۔ اس کا " سوز دروں " اس کی " آہِ سحر گاہی " اس کا " عشق "

اس کا "فقر" اور اس کی "خودی" یہ سب کے سب ایک مسلمان کی سچی زندگی کے حقیقی صفات ہیں اقبال کا "مردِ مومن" دراصل قرآنی نظریہ کا "انسانِ کامل" ہے۔

علامہ اقبال کی ہمہ گیر شاعری کی بنیاد پر اقبال کو کسی خاص طبقہ کا شاعر کہنا میرے نزدیک بڑی کوتاہ بینی ہے۔ حالانکہ علامہ اقبال کا وہ خط جو پروفیسر آل احمد سرور کے نام ابھی چند سال ہوئے شائع ہو چکا ہے جس میں علامہ اقبال نے صاف لفظوں میں اس کا اظہار کیا ہے کہ "میرے سامنے فاشزم اور کمیونزم یا زمانہ حال کے اور "ازم" کوئی حقیقت نہیں رکھتے میرے عقائد کی رو سے صرف اسلام ہی ایک حقیقت ہے جو بنی نوع انسان کیلئے ہر نقطۂ نگاہ سے موجب نجات ہو سکتی ہے ——" اتنے صاف اور صریح بیان کے بعد اقبال کے فکر کی ایسی توجیہیں! ——

ہے حقیقت یا مری چشم غلط بیں کا فساد

اب آئیے ذرا تفصیل سے جائزہ لیا جائے کہ اقبال کے نزدیک ساری انسانیت کے درد کا مداوا "اشتراکیت" کس قدر ہے؟ صرف بلند بانگ دعوے اور علمی انداز بیان سے حقیقت پر پردہ نہیں ڈالا جا سکتا۔ اقبال کے کلام کا تنقیدی مطالعہ ہمیں اس حقیقت کی طرف

اچھی طرح نشاندہی کرتا ہے کہ اشتراکیت "خطوطِ خمدار" اور "مریزِ کج دار" کی نمائش کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اقبال کے کلام میں محکوموں کے ابھارنے مزدوروں کے سنوارنے، ضعیفوں اور مظلوموں کی حمایت کے جو عناصر پائے جاتے ہیں وہ اس بات کی دلیل نہیں کہ علامہ اقبال اشتراکیت اور اس کے بنیادی فلسفہ کے بھی قائل ہیں، بلکہ "اسلام" جو اقبال کی شاہراہِ حیات ہے اور "قرآن" جو اس کا دستورِ زندگی ہے نہ صرف ان اصولوں کا حامی ہے، بلکہ ان کا پرجوش داعی و مبلغ بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کے کلام میں یہ عناصر بہت زیادہ اجاگر ہیں۔ ؎

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغامِ مرگ
دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ

اشتراکیت کا بنیادی فلسفہ تاریخ کی مادی تعبیر ہے جسکے نتیجہ میں "لا سلاطین" "لا کلیسا" "لا الٰہ" اس کا اصل "نعرہ" قرار پایا لیکن اقبال کا کائناتی اسلامی فلسفہ صرف سلبی صورت دنیا کے سامنے پیش نہیں کرتا بلکہ اثباتی پہلو بھی رکھتا ہے، اس کے نزدیک کائنات کے وجود کا راز اور اس کی حقیقت "لا و الّا" میں پوشیدہ ہے۔ "نفی بے اثبات مرگِ امتاں" ہے دونوں کا امتزاج ہی انسان کے کمال کا باعث بن سکتا ہے، اس سلسلہ میں اقبال کے یہ چند اشعار اس کے فکر کی

پوری ترجمانی کرتے ہیں سے

نکتہ می گوید از مردان حال
امتاں را لا جلال الا جمال

لا و الاّ احتساب کائنات
لا و الاّ فتح باب کائنات

تا نہ رمز لا الہ آید بدست
بند غیر اللہ را نتواں شکست

درجہاں آغاز کار از حرف لاست
ایں نخستیں منزل مرد خداست

اقبال کا یہ فلسفہ زندگی انسان میں خودی، خود داری خود اعتمادی پیدا کرتا ہے، اور یہی لا و الاّ ہے جس کی حقیقت احتساب کائنات ہے، جس کا لازمی نتیجہ ہے فتح باب کائنات! یہ لا الہٰ ہی کا رمز ہے جو محکوم کو حاکم کے سخت پنجہ سے اور مظلوم کو ظالم کے خونیں چنگل سے نجات بخشتا ہے۔

اشتراکیت جس کی بنیاد "نفی" پر ہے۔ جس نے نفی ہی کے ذریعہ تمام پرانے رسوم و قیود سے آزادی حاصل کی۔ لیکن یہ نفی "نفی بے اثبات" ہے، جو دراصل "مرگ امتاں" ہے اور یہ آزادی دوامی نہیں بلکہ عارضی ہے

اسی نکتہ کی طرف اقبال نے "روس" کو متوجہ کیا ہے ؎

روس را قلب و جگر گردیدہ خوں
از ضمیرش حرفِ لا آمد بروں
آں نظامِ کہنہ را برہم زد است
تیز نیشے بر رگِ عالم زد است
فکرِ او در تند بادِ لا بماند
مرکبِ خود را سوئے الا نراند
آیدش روزے کہ از زورِ جنوں
خویش را زیں تند باد آرد بروں
در مقامِ لا نیاساید حیات
سوئے الا می خرامد کائنات
لا و الا سازو برگِ امتاں
نفی بے اثبات مرگِ امتاں

ایک دوسری نظم میں علامہ اقبال نے اشتراکی ہیئت اجتماعی کی غلطی کا صاف لفظوں میں اظہار اور "صاحب سرمایہ" کی فکری بے راہ روی اور حق ناشناسی کا ببانگ دہل اعلان کیا ہے۔ اخوت و مساوات کی غلط بنیادوں کی طرف بھی خوب نشاندہی کی ہے، اور

صحیح حیثیت کو اجاگر کیا ہے ؎

صاحب "سرمایہ" از نسلِ خلیل
یعنی آں پیغمبر بے جبرئیل

زانکہ حق در باطل او مضمر است
قلب او مومن دماغش کافر است

غربیاں گم کردہ اند افلاک را
در شکم جویند جانِ پاک را

رنگ و بو از تن نگیرد جانِ پاک
جز بتن کارے ندارد اشتراک

دین آں پیغمبر حق ناشناس
بر مساوات شکم دارد اساس

تا اخوت را مقام اندر دل است
بیخ او در دل نہ در آب و گل است

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ علامہ اقبال نے اشتراکیت پر نہایت صریح اور صاف تنقیدیں کی ہیں اور علامہ کو اس سے شدید اختلاف رہا ہے، لیکن اس کا یہ مطلب قطعاً نہیں کہ اقبال نے سرمایہ داری اور ملوکیت کی حمایت کی ہے، بلکہ سچ یہ ہے کہ وہ شہنشاہیت و استبدادیت کے بھی

شدید ترین دشمن ہیں، سرمایہ دار نہ صرف یہ کہ انسانیت کا دشمن ہے، بلکہ اس کی مثال اس خونخوار درندے کی ہے جو کمزوروں کا خون چوستا اور ہڈی نوچتا رہتا ہے۔ طوالت کا خوف مانع ہے ورنہ ملوکیت اور استبدادیت کی تردید میں علامہ اقبال نے جو کچھ کہا ہے اسے بھی پیش کرتا مندرجہ بالا نظم میں بھی چند اشعار کے بعد ملوکیت کی مذمت کرتے ہیں پھر فرماتے ہیں ؎

ہر دو را جاں ناصبور و ناشکیب
ہر دو یزداں ناشناس آدم فریب
زندگی ایں را خروج آں را خراج
درمیاں ایں دو سنگ آدم زجاج
غرق دیدم ہر دو را در آب و گل
ہر دو را تن روشن و تاریک دل
زندگانی سوختن با ساختن
در گلے تخم دلے انداختن

اشتراکیت و ملوکیت دونوں ہی خدا ناشناس اور آدم فریب ہیں۔ آج کی انسانیت اِن دونوں پتھروں کے درمیان شیشہ کی طرح چور چور ہو رہی ہے اگر آج اشتراکیت کا بوس بن کر اپنے علم و فن

اور فلسفہ سے دنیا کو شکست دے رہی ہے تو سرمایہ داری انسانیت کے بدن سے روح و زندگی کھینچے لے رہی ہے اور فقر و فاقہ سے نواز رہی ہے حق تو یہ ہے کہ دونوں "مادیت" میں غرق ہیں۔ اور دونوں کا چہرۂ روشن اندروں چنگیز سے تاریک تر ہے!

یہ جو کچھ عرض کیا گیا اس سے علامہ اقبال کا اشتراکیت کے بارے میں جو اصولی اور بنیادی اختلاف ہے اس کا اظہار ہوتا ہے — اشتراکیت کی تردید اور عالم کی اصلاح و بقاء کیلئے ایک صالح نظام کی طرف اشارہ اقبال نے اپنی ایک نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں واضح اور کھلے لفظوں میں کیا ہے۔ اقبال کے فکر و عقیدہ کی وضاحت کے لئے اس کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ ابلیس کی زبان میں اشتراکیت کی پریشاں حالی، آشفتہ مغزی کا صاف صاف اعلان کیا گیا ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو شائد غلط نہ ہو کہ اشتراکی فکر کی حقیقت کھول کر رکھ دی ہے اور یہ بات یقیناً سچ ہے کہ ؎

دست فطرت نے کیا ہے جن گریبانوں کو چاک
مزدکی منطق کی سوزن سے نہیں ہوتے رفو

پھر اشتراکی انقلابیوں کے نام ایک کھلا چیلنج ہے ؎

کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشاں روزگار آشفتہ مغز آشفتہ مو

"ابلیسی نظام" کو سارا خطرہ اور خوف اشتراکیت سے نہیں بلکہ سے

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرار آرزو

خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشک سحر گاہی سے جو ظالم وضو

جانتا ہے جس پہ روشن باطن ایام ہے
مزدکیت فتنۂ فردا نہیں اسلام ہے

اس پھیلے ہوئے شیطانی نظام حیات کو اگر کوئی "خطرہ" ہے تو وہ اشتراکیت سے نہیں بلکہ اسلام سے ہے۔ موجودہ شیطانی نظاموں کی جو چکی ساری انسانیت کو پیس رہی ہے اس سے چھٹکارے کا واحد علاج اقبال کے نزدیک "اسلام" ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس زمانے میں "ہے وہی سرمایہ داری بندہ مومن کا دین"! لیکن عصر حاضر کے تقاضاؤں سے ابلیس کا یہ خوف بجا ہے کہ ع

ہو نہ جائے آشکارا شرع پیغمبر کہیں

وہ شرع پیغمبر اور آئین اسلام کیا ہے؟ جس سے پورا "ابلیسی نظام" حیران و سرگرداں نظر آتا ہے؟ چلتے چلتے اُسے بھی ابلیس ہی کی زبان سے سُن لیجئے سے

الحذر آئین پیغمبر ہے سو بار الحذر
حافظ ناموس زن مرد آزما مرد آفریں

موت کا پیغام ہر نوع غلامی کیلئے
نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیر رہ نشیں

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں

رات کی اس تاریکی میں جبکہ ساری انسانیت حیران و سرگرداں بھٹکتی پھر رہی ہے یہی وہ اصول زندگی ہیں جن سے سحر کی روشنی نمودار ہو سکتی ہے اور اسی میں اس سوال کا جواب پنہاں ہے کہ ——

کیوں نہیں ہوتی سحر حضرت انساں کی رات

عورت اور اقبال

اس دور کی "تہذیب جدید" کے بطن سے جہاں اور بہت سے نئے نئے مسئلے پیدا ہوئے، اُن میں سے ایک مسئلہ عظیم "عورت" کا بھی ہے یہ مسئلہ آج جتنا نیا ہے اتنا ہی پرانا بھی! جدید اس قدر کہ شاید آج سب سے زیادہ "نیاپن" اس مسئلہ میں ہے اور قدامت کا یہ حال کہ جب سے دنیا کا وجود ہوا اس وقت سے معاشرت میں "عورت" کا مسئلہ ایک اہم مسئلہ بن کر نمودار ہوتا رہا ہے، علماء و مفکرین نے ہر دور اور ہر زمانے میں اس مسئلہ کو سلجھانے کی کوششیں کیں، مگر بجائے سلجھنے کے الجھاؤ بڑھتا ہی گیا، ہر ناخن سے مزید گرہیں پڑتی گئیں، اور یہ مسئلہ جہاں تھا وہیں رہا ؎

ہزار بار حکیموں نے اس کو سلجھایا
مگر یہ مسئلۂ زن رہا وہیں کا وہیں

"مسئلۂ زن" کی ہر دور اور ہر زمانے میں ایک خاص اہمیت رہی ہے، کب اور کس زمانے میں عورت کی کیا حیثیت تھی؟ اور اس میں

رفتہ رفتہ کس طرح تبدیلی ہوتی رہی ؟ یہ تاریخ کا ایک طویل تجزیہ ہوگا' اس وقت میرا موضوع عورت کی تاریخی حیثیت بیان کرنا نہیں ہے بلکہ عورت کا صحیح مقام جو اقبال نے متعین کیا ہے اُسے پیش کرنا ہے۔

اقبال کا فکر چونکہ اسلامی فکر ہے اور اسلام نے عورت کو جو مقام بلند عطا کیا ہے اور اس کو پستی سے جس بلندی پر لا کھڑا کیا ہے اُس سے کوئی بھی صاحب فکر و نظر انکار نہیں کر سکتا۔ عورت کی حیثیت اور اس کی اہمیت کو اقبال کے فکر کی جولانیوں نے اس طرح بیان کیا ہے[۵]

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اُسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں
شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشتِ خاک اس کی
کہ ہر شرف ہے اُسی درج کا درِ مکنوں
مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں

آپ نے دیکھا اقبال نے عورت کے مقام کو کائنات میں کس قدر اہم دکھایا ہے۔ کائنات کی یہ ساری بوقلمونی صرف اسی کے وجود سے رنگین ہے' اسی کی ذات سے زندگی کے ساز میں ایک سوز ہے ورنہ اس کے بغیر یہ جہانِ رنگ و بو ایک بے جان لاشہ ہے' جس میں

نہ کوئی زندگی ہے اور نہ سوز و گداز! اور اس کے شرف و منزلت کا مقام اتنا بلند ہے کہ اس کی مشتِ خاک کے سامنے "ثریا" بھی شرمسار اور یہیں تک نہیں بلکہ آج ہر عز و شرف اسی کے درج کا ایک موتی ہے۔

اقبال کے نزدیک عورت کی فطری جبلت اس کی نسوانیت ہے سیاست و معیشت، دفتر اور کارخانہ اس کے نسوانی حسن اور جوہر کے لئے سم قاتل ہے۔ عورت کے حسن و جمال کی تابناکی اس کے نسوانی جوہر کی مرہون منت ہے۔ مکالمات فلاطون نہ لکھنا اس کے لئے کوئی عیب نہیں، اس کا حسنِ ہنر یہ ہے کہ اس کی گود سے ایسے افلاطونِ علم و حکمت پیدا ہوں جو "مکالمات فلاطون" لکھ سکیں —

اسلام نے عورت کو تو یہ مقام بلند بخشا ہے، جس کی صحیح تعبیر علامہ اقبال کی زبانی آپ نے دیکھی، لیکن آج "تہذیب کے فرزند" عورت کو جو مقام عطا کر رہے ہیں۔ وہ ہر عورت و مرد کیلئے قابل توجہ اور باعث حسرت و افسوس ہے۔ نام نہاد "مساوات" کے نعرہ نے خود عورت کو مسحور کر رکھا ہے اور خود غرض مرد اپنی خود غرضی اور ہوس کی تکمیل کے لئے اس شعلہ میں ہوا دے کر مزید تیزی پیدا کر رہا ہے تاکہ اس کی عصمت اور عزت و شرافت میں آگ لگ جائے اور وہ

اور وہ مرد کی ہوس رانیوں کے چرنوں پر اپنے آپ کو بھینٹ چڑھا دے اِس ہلاکت و بربادی اور ساری خرابی میں قصور کچھ "عورت" کا نہیں بلکہ یہ سارا فساد فرنگی معاشرت کا پیدا کردہ ہے ۔ اقبال مرحوم نے سچ کہا ہے اور عورت کی معصومیت کا کتنا خیال رکھا ہے ۔

قصور زن کا نہیں کچھ اس خرابی میں
گواہ اس کی شرافت پہ ہیں مہ و پرویں
فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور
کہ مرد سادہ بیچارہ زن شناس نہیں

مغربی تہذیب کی پروردہ معاشرت کا فساد جو پھوٹا تو اس کا اثر مرد و عورت دونوں پر پڑا ' اس مغربی معاشرت کا کمال جس حد تک ہے اس کا تجزیہ "ایک سوال" کے عنوان سے حکیم مشرق نے اچھا کیا ہے

کوئی پوچھے حکیم یورپ سے
ہند و یوناں ہیں جس کے حلقہ بگوش
کیا یہی ہے معاشرت کا کمال؟
مرد بے کار ' زن تہی آغوش

آج کی دنیا میں عورت کے متعلق جو سب سے زیادہ اہم اور بڑا مسئلہ درپیش ہے وہ "پردہ" کا ہے ۔ پردہ کے کیا فوائد ہیں ؟

اوراس سے کیا کیا نقصانات مترتب ہوتے ہیں ؟ پردہ ضروری ہے یا نہیں ؟ اس قسم کے جتنے سوالات ہیں یا ہو سکتے ہیں اس پر ارباب فکر نے تو اچھی خاصی تصنیفیں کی ہیں اور ابھی اس پر مزید لکھی جا سکتی ہیں لیکن اس وقت اس مسئلہ کو ہم اقبال ہی کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

اقبال کی بلند پروازی دیکھئے، وہ کہتا ہے کہ تم "عورت" کے "پردہ" میں رہنے یا نہ رہنے کے متعلق کیا کہتے ہو؟ ابھی خود مرد تو "پردہ" سے باہر نکلا ہی نہیں، جس طرح عورت "خلوت نشیں" ہے مرد بھی "خلوت نشیں" ہے! ابھی اولاد آدم خود پردہ میں ہے۔

تفاوت نہ دیکھا زن وشو میں میں نے
وہ خلوت نشیں ہے، یہ خلوت نشیں ہے
ابھی تک ہے پردہ میں اولاد آدم
کسی کی خودی آشکارا نہیں ہے

اقبال بے پردگی پر "پردہ" کو ترجیح دیتا ہے، وہ کہتا ہے کہ "خلوت" بہرحال "جلوت" سے بہتر ہے۔ اس دور کی ساری برائی "جلوت" ہی کی ہوس سے ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ نگاہیں تو روشن ہیں لیکن "آئینۂ دل" تاریک و مکدر ہے اور ساتھ ساتھ اس بات کی طرف بھی متوجہ کرتا ہے کہ "ذوق نظر" اپنے طور پر برا نہیں، لیکن

یہ اگر اپنی حدوں سے بڑھ جائے تو اس کا لازمی نتیجہ ہے کہ افکار ابتر و پراگندہ ہو جائیں۔ اس "مسئلہ پردہ" میں بھی "ذوق نظر" نے اپنی حدوں سے تجاوز کیا جس کے نتیجہ میں افکار و خیالات پراگندہ و پریشان ہو کر رہ گئے ہیں۔

رسوا کیا اس دور کو جلوت کی ہوس نے
روشن ہے نگہ، آئینۂ دل ہے مکدّر
بڑھ جاتا ہے جب ذوق نظر اپنی حدوں سے
ہو جاتے ہیں افکار پراگندہ و ابتر

"خلوت" کو "جلوت" پر ترجیح اور "بے پردگی" پر "پردہ" کی اہمیت کو اقبال کی بلند نظری نے کتنی اچھی دلیل فراہم کی ہے۔ یہ اسی کے فکر عمیق کا حصہ ہے، کہتا ہے ؎

آغوش صدف جس کے نصیبوں میں نہیں ہے
وہ قطرۂ نیساں کبھی بنتا نہیں گوہر

لیکن اس کے بعد وہ شکوہ سنج ہے کہ افسوس یہ خلوت، جس میں انسانی خودی پروان چڑھتی اور خودگیر ہوتی ہے، کہیں اور تو کیا اب دیر و حرم میں بھی میسر نہیں ؎

خلوت میں خودی ہوتی ہے خودگیر و لیکن
خلوت نہیں اب دیر و حرم میں بھی میسر

"عورت" کے متعلق دوسرا "نعرہ" جو انتہائی زور و شور سے لگایا جا رہا ہے وہ "آزادیٔ نسواں" کا ہے۔ اس "نعرہ" کے پس منظر میں بھی وہی مرد کی خود غرضی کام کر رہی ہے۔ جس نے صنف نازک کو کارخانوں، دفتروں اور زندگی کے دوسرے پر مشقت کاموں میں آج لا کھڑا کیا ہے اور "چراغ خانہ" سے "شمع محفل" بنا دیا۔ اس پر عورت بھی خوش ہے۔ آہ! مغرب کا خوشنما فریب!

آزادیٔ نسواں کی یہ تحریک دراصل جدید مغربی تہذیب ہی کا اثر ہے۔ جسے "تہذیب کے فرزندوں" نے ہوا دے رکھی ہے، اور جس کا مقصد یہ ہے کہ عورتوں کو ہر معاملے میں مردوں کے دوش بدوش کھڑا کر دیا جائے۔ اقبال عورت اور مرد کی مکمل مساوات کا قائل نہ تھا، اقبال نے اپنے ایک لکچر میں اس مسئلہ پہ بہت صاف لفظوں میں اظہار خیال کیا ہے۔

"میں مرد اور عورت کی مساوات مطلق کا حامی نہیں ہوں
قدرت نے ان دونوں کے تفویض جدا جدا خدمتیں کیں،
اور ان فرائض جداگانہ کی صحیح اور باقاعدہ انجام دہی
خانوادۂ انسانی کی صحت اور فلاح کے لئے لازمی ہے
مغربی دنیا میں جہاں نفسی نفسی کا ہنگامہ گرم ہے اور

غیر معتدل مسابقت نے ایک خاص قسم کی اقتصادی حالت پیدا کر دی ہے۔ عورتوں کو آزاد کر دیا جانا ایک ایسا تجربہ ہے جو میری دانست میں بجائے کامیاب ہونے کے الٹا نقصان رساں ثابت ہوگا اور نظام معاشر میں اس سے بعید پیچیدگیاں واقع ہو جائیں گی اور عورتوں کی اعلیٰ تعلیم سے بھی جس حد تک کہ افراد قوم کی شرح ولادت کا تعلق ہے جو نتائج مترتب ہوں گے وہ بھی غالباً پسندیدہ نہ ہوں گے، خاندانی وحدت کے رشتہ کو جو بنی نوع انسان کی روحانی زندگی کا جزو اعظم ہے یہ حریت توڑ دیتی ہے —

(ملت بیضا پر عمرانی نظر صفحہ ۳۹ از روح اقبال)

اس کے علاوہ اقبال نے "جاوید نامہ" میں تجدد پسند عورت کا خاکہ تفصیل سے کھینچا ہے جس سے آزادی نسواں کی حقیقت کا پتہ چلتا ہے ڈاکٹر یوسف حسین نے اپنی کتاب "روح اقبال" میں اس کا ماحصل ان لفظوں میں بیان کیا ہے۔ مناسب ہے کہ اس موقع پر اسی کو یہاں نقل کر دیا جائے۔

"عالم علوی کی سیر کے دوران میں دوشیزہ مریخ سے

اس کی ملاقات ہوگئی ۔ ایک وسیع میدان میں مردوں اور عورتوں کا ہجوم تھا، اس ہجوم میں ایک بلند و بالا اور روشن جبیں عورت نظر آئی، لیکن اس کے چہرے کی رونق میں نور جاں کی کمی محسوس ہوتی تھی، اس کی باتیں بے سوز اور آنکھیں بے نم تھیں ۔ وہ سُرور آرزو سے یکسر محروم تھی ، اس کا سینہ جوش شباب سے عاری اور عشق و شوق کی لذتوں سے بے خبر تھا ۔حکیم مریخ نے اقبال کو بتایا کہ یہ عورت فرنگستان کی رہنے والی ہے اور نبوت کی مدعی ہے ۔ اس کا پیغام صنف نازک کو مرد کی غلامی سے آزاد کرانا ہے ۔ مختصر طور پر اس کی تعلیم یہ ہے ۔

اے زناں، اے مادراں، اے خواہراں
زیستن تا کے مثال دلبراں
دلبری اندر جہاں مظلومی است
دلبری، محکومی و محرومی است
در دو گیسو شانہ گردانیم ما
مرد را نخچیر خود دانیم ما
مرد صیادی بہ نخچیری کند
گرد تو گردد کہ زنجیری کند

ہم برا و بودن آزار حیات
وصل او زہر و فراق او نبات
مار پیچاں از خم و پیچش گریز
زہر ہائش را بخون خود مریز
از امومت زرد روئے مادراں
اے خنک آزادی بے شوہراں

پھر آگے چل کر وہ اپنی ہم صنفوں کو سمجھاتی ہے کہ اب زمانہ بدل گیا ہے، سائنس نے تمام اقدار حیات کو الٹ پلٹ دیا ہے' اب نسل انسانی بغیر عورتوں کے بھی دنیا میں جاری رہ سکے گی، سائنس دانوں کے معملوں میں جتنی آبادی کی ضرورت ہوگی اتنے بچے پیدا کر لئے جائیں گے۔ ضرورت کے مطابق لڑکے ہوں گے اور ضرورت کے مطابق لڑکیاں ہوں گی۔ انسانی عقل اب اسرار حیات کو اس طرح جدید طور پر ظاہر کرے گی اور تار زیست بے مضراب کے اپنے نغمے پیدا کر سکے گا' پھر کیا وجہ ہے کہ ہم بھی مردوں کی طرح آزاد نہ ہوں —"

(روح اقبال)

اقبال "آزادی نسواں" کے اس زہر کو اچھی طرح سمجھتا ہے

اور جاننا ہے کہ عورت کے لئے کونسی چیز زہر ہلاہل ہے اور کیا قند شیریں؟ ع

میں خوب سمجھتا ہوں یہ زہر ہے یہ قند

ایک تیسری چیز جس کا اس زمانے میں بڑا چرچا ہے وہ ہے عورت کے لئے موجودہ مغربی تعلیم کا حاصل کرنا، تاکہ وہ تہذیب فرنگ میں پوری طرح فٹ آ سکے۔ مغربی تہذیب و تمدن نے عورت کو اس کے جس مقام سے ہٹا دیا ہے یعنی اس کا "ماں" ہونا وہ ارباب فکر و نظر سے پوشیدہ نہیں۔ آج مغرب زدہ لڑکیاں "ماں" بننے سے جس قدر گھبرائی ہیں وہ سب پر عیاں ہے اور اس کے لئے جتنے جتن کئے جاتے ہیں وہ کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں، انسانیت کی یہ موت اقبال سے دیکھی نہ گئی اور وہ چیخ اٹھا ؎

تہذیب فرنگی ہے اگر مرگ امومت
ہے حضرت انساں کیلئے اس کا ثمر موت

یہ "تہذیب فرنگی" اسی مغربی تعلیم ہی کا تو کرشمہ ہے، جسکے حصول کے بعد عورت اپنا مقام کھو بیٹھتی ہے۔ اقبال کہتا ہے

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو ارباب نظر موت

بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسۂ زن ۔۔۔ ہے عشق و محبت کیلئے علم و ہنر موت

جس علم سے جنسِ لطیف "جنسِ کثیف" بننے کی کوشش کرے، اور جس علم سے نسوانیت کا خون ہو، جس سے عورت میں "نسائیت" کے بجائے بہ تکلف "رَجُلیت" کا اظہار ہو، وہ علم، علم نہیں بلکہ موت ہے۔ اور یہ انسانیت کے لئے ایک المناک حادثہ، اور اس کی موت کا پیام ہے۔

اقبال کہتا ہے یہ سچ ہے کہ دنیا نے عورت کو جو مقام دینا چاہیے تھا، وہ نہ دیا، خصوصاً مشرق میں وہ بہت مظلوم ہے اور اس کی اس مظلومی سے میں خود بھی بہت غمناک ہوں۔

میں بھی مظلومیٔ نسواں سے ہوں غمناک بہت
نہیں ممکن مگر اس عقدۂ مشکل کی کشود

اقبال کے نزدیک عورت کی یہ مظلومیت یقیناً قابلِ افسوس ہے اور اس عقدہ کی گرہ کشائی مشکل ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انسان اس کے ردِ عمل میں اپنی انسانیت کو بھی کھو بیٹھے، یہاں تک کہ اس کی عقل پر ایسا پردہ پڑ جائے کہ زہر و قند کی بھی تمیز نہ کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے عورت کی اصل حقیقت کی طرف اس نظم کے ابتدا ہی میں اشارہ کر دیا ہے تاکہ عورت کی صحیح حیثیت متعین ہو سکے۔

جوہرِ مرد عیاں ہوتا ہے بے منتِ غیر
غیر کے ہاتھ میں ہے جوہرِ عورت کی نمود

اقبال کے نزدیک "جوہر عورت" کی "نمود" مرہون منت ہے غیروں کی،
اور سچ تو یہ ہے کہ "بے منت غیر" اس کے جوہر کے آب میں تاب
پیدا نہیں ہو سکتی۔

اقبال عورت اور اس کے مقام کو خوب سمجھتا ہے، اور
کہتا ہے کہ اس کے متعلق ایک "زندہ حقیقت" میرے سینے میں پوشیدہ ہے،
اور جو بات آج ایک اچھا خاصا "مولوی" کہنے سے گھبراتا ہے اُسے
وہ ببانگ دہل کہتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے یہ مغربی تہذیب کی پروردہ
دنیا چاہے جو بھی کہے لیکن جو حقیقت ہے وہ بہر حال حقیقت ہے اسمیں
کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی اور وہ عورت کا آخری حل پیش کر دیتا ہے۔

ایک زندہ حقیقت ہے مرے سینے میں مستور
کیا سمجھے گا وہ جس کی رگوں میں ہے لہو سرد
نے پردہ، نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی
نسوانیت زن کا نگہباں ہے فقط مرد

الرِّجال قوامون علی النساء کی تفسیر اس سے بہتر اور کیا ہو سکتی ہے؟
اقبال کے خیال میں جو قوم اس "زندہ حقیقت" کو نہ دیکھ سکے
اور اپنی آنکھوں پر مغربی تہذیب و تمدن کی وہی موٹی عینک لگائے رہے
تو وہ قوم ہلاکت و بربادی سے دوچار ہو گی اور اس قوم کا خورشید

جہاں تاب نہ ہو سکے گا بلکہ جلد ہی زرد ہو کر رہ جائے گا۔

جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا
اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

اقبال کی نگاہ میں ایک مثالی عورت، جس کی سیرت عورتوں کے لئے آئیڈیل اور نمونہ ہو، وہ حضرت فاطمہ زہرا رض کی زندگی اور سیرت ہے۔ اقبال کہتے ہیں، حضرت فاطمہ رض کی زندگی بحیثیت ایک بیٹی، بیوی اور ماں کے دنیا کی تمام عورتوں کے لئے ایک مثالی زندگی ہے اور ایک ایسا نمونہ ہے جو آج بھی تہذیب جدید کی عورت کے لئے شمع ہدایت ہو سکتا ہے ؎

مزرع تسلیم را حاصل بتول
مادراں را اسوۂ کامل بتول

ایک عورت کا سب سے بڑا کارنامہ ہے کہ اسکی گود سے حسین رض جیسا فرزند پیدا ہو، اور بڑی قابل قدر اور باعث فخر ہیں وہ مائیں جن کی گود سے ایسے افراد پیدا ہوئے، جن کی زندگی کا مقصد خدمت حق تھا۔ اسلامی تاریخ پر جب ہم ایک نگاہ ڈالتے ہیں تو ہم کو ایسی مائیں نظر آتی ہیں جنہوں نے عمر ابن عبدالعزیز کو پیدا کیا، محمد بن قاسم کو پروان چڑھایا، جن کی گودوں سے طارق ابن زیاد، موسیٰ

ابن نصیر جیسے فاتح پیدا ہوئے۔ اور جنہوں نے امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ جیسے محدث، امام ابو حنیفہؒ اور امام شافعیؒ جیسے فقیہہ امام غزالیؒ، ابن تیمیہؒ ابن قیمؒ اور شاہ ولی اللہ جیسے مفکر اسلام پیدا کئے۔ اقبال نے اِسی حقیقت کو اس طرح بیان کیا ہے۔

فطرت تو جذبہ ہا دارد بلند
چشم ہوش از اسوۂ زہرا مبند
تا حسینے شاخ تو بار آورد
موسم پیشیں بگلزار آورد

تعلیم اور اقبال

اقبال صرف شاعر ہی نہ تھا بلکہ ایک بڑا فلسفی، ایک زبردست مفکر اور مدبر بھی تھا۔ شاعری اس کے لئے "جزو پیغمبری" تھی اس طرح اسے شاعر اور صرف شاعر ہی نہیں بلکہ "شاعر عظیم" کہا جا سکتا ہے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ افکار و جذبات سے قطع نظر اردو شاعری میں جو نیا طرز ادا اور اسلوب بیان اقبال نے اختیار کیا ہے، وہ جدید اردو شاعری میں سنگ بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔

اقبال نے زندگی پر ایک خاص نقطہ نظر سے نگاہ ڈالی ہے اور یہی وجہ ہے کہ زندگی کے تمام شعبوں کا اس نے اپنی شاعری میں تجزیہ کیا ہے۔ اقبال کے فکر کا خاص محور ان کا "فلسفہ خودی" ہے۔ ان کے نزدیک "انسانیت" کی تکمیل "خودی" کے پیدا ہونے کے بعد ہی ہو سکتی ہے، اسی لئے علامہ اقبال نے تعلیم کا اصل مقصد "خودی" کی نشو و نما قرار دیا ہے، جیسا کہ "ضرب کلیم" میں "تعلیم و تربیت" کے عنوان کے تعلیم کا "مقصود" بیان کیا ہے۔ پہلے حکما، کی ترجمانی کرتے ہیں۔

اسپنوزا

نظر حیات پہ رکھتا ہے مرد دانشمند
حیات کیا ہے؟ حضور و سرور و نور و وجود

افلاطون

نگاہ موت پہ رکھتا ہے مرد دانشمند
حیات ہے شب تاریک میں شرر کی نمود

لیکن اقبال کے نزدیک ــــــ

حیات و موت نہیں التفات کے لائق،
فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصود

خودی کی زندگی کی تصویر علامہ اقبال نے اس طرح کھینچی ہے ۔

خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی
نہیں ہے سنجر و طغرل سے کم شکوہ فقیر،
خودی ہو زندہ تو دریائے بیکراں پایاب
خودی ہو زندہ تو کہسار پرنیان و حریر
نہنگ زندہ ہے اپنے محیط میں آزاد
نہنگ مردہ کو موج سراب بھی زنجیر

اور اسی " خودی کی تربیت " پر زور بھی دیا ہے ۔ فرماتے ہیں ۔

خودی کی پرورش و تربیت پہ ہے موقوف
کہ مشتِ خاک میں پیدا ہو آتش ہمہ سوز

یہی ہے سرّ کلیمی ہر اک زمانے میں
ہوائے دشت و شعیب و شبانیٔ شب و روز

لیکن یہی "خودی" ہے جس کی تعلیم سے آج تمام تعلیمی ادارے بے بہرہ ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ایسا غلامانہ نظام تعلیم رائج ہے جس کا لازمی نتیجہ ہو کہ "خودی" کے صحیح احوال و مقامات پوشیدہ رہیں۔

اقبال یہاں نام نہ لے علم خودی کا
موزوں نہیں مکتب کیلئے ایسے مقالات

بہتر ہے کہ بیچارے ممولوں کی نظر سے
پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات

موجودہ نظام تعلیم نہ صرف یہ کہ خودی کی تعلیم سے خالی ہے بلکہ مذہب و اخلاق جس پر خودی کی تعلیم و تربیت موقوف ہے، اسکی بیخ کنی کی گئی ہے

اور یہ اہل کلیسا کا نظام تعلیم
ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

اس دور کا تعلیمی نظام صرف "معاش" کے حصول کا ذریعہ ہے، گویا ساری زندگی کو معاش کے اندر محدود کر دیا گیا ہے۔ زندگی کی تمام قوتیں اور توانائیاں معاش کے حصول کی فکر میں ختم کر دی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علمی و فکری صلاحیتیں ہمارے طلباء سے روز بروز مفقود ہوتی جا رہی ہیں

فکر و نظر کی پستی، علمی ہلکا پن نمایاں ہے، جوانی کی وہ ساری قوتیں، صلاحیتیں اور توانائیاں جو زندگی کو پروان چڑھاتی ہیں، ان کے سوتے خشک ہو کر رہ گئے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ حکیم مشرق کی زبان سے سنیئے

عصر حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے
قبض کی روح تری، دے کے تجھے فکر معاش
دل لرزتا ہے حریفانہ کشاکش سے ترا
زندگی موت ہے کھو دیتی ہے جب ذوق خراش
اس جنوں سے تجھے تعلیم نے بیگانہ کیا
جو یہ کہتا تھا خرد سے کہ بہانے نہ تراش
فیض فطرت نے تجھے دیدۂ شاہیں بخشا
جس میں رکھ دی ہے غلامی نے نگاہ خفاش
مدرسہ نے تری آنکھوں سے چھپایا جن کو
خلوت کوہ و بیاباں میں وہ اسرار ہیں فاش

اور یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال نے "علمی زندگی" کے بجائے بیرسٹری کے آزاد پیشہ کو پسند کیا۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے ان سے ایک بار یہ دریافت کیا بہتر نہیں تھا کہ آپ پروفیسر ہو جاتے؟ تو فرمانے لگے میں نے کچھ دنوں پروفیسری کی اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ ہندوستانی کالجوں کی پروفیسری میں

علمی کام تو ہوتا نہیں البتہ ملازمت کی ذلتیں ضرور سہنی پڑتی ہیں۔"

لیکن بد قسمتی تو یہ ہے کہ یہ "معاش" جس کے لئے یہ سارے پاپڑ بیلے گئے اور جس کے چرنوں پر مذہب و اخلاق کے بھینٹ چڑھائے گئے وہ بھی حاصل نہ ہوسکی اور آج کل "بیکاری" ایک مستقل "معاشی مسئلہ" بن کر سامنے آگئی ہے جس سے ملک کا پورا معاشی نظام متاثر ہے۔

بایں مکتب بایں دانش چہ نازی
کہ ناں درکف ندارد وجاں زتن برد

اس سلسلے میں اقبال کا نظریۂ تعلیم یہ ہے کہ ایسا نظام تعلیم ہونا چاہیے جس میں دین و اخلاق اور صنعت کو ایک نمایاں حیثیت حاصل ہو اور ان کو تعلیم کا ایک ضروری جز قرار دیا جائے۔ چنانچہ فرماتے ہیں

بہ پور خویش دین و دانش آمیز
کہ تابد چوں مہ و انجم نگینش
بدست او اگر داری ہنر را
ید بیضا است اندر آستینش

اس سے پہلے یہ کہا جا چکا ہے کہ اقبال تعلیم کا اصل مقصود "خودی" کا پروان چڑھانا سمجھتا ہے جو انسانیت کی تکمیل کا پیش خیمہ ہے۔ نرا علم اس کے نزدیک کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا، علم کے ساتھ ساتھ عمل

جیسے علامہ اقبال زندگی، عشق اور دوسرے مختلف الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں بہت ضروری ہے' ان کے خیال میں اہل نظر کو اہل دانش پر فضیلت حاصل ہے ۔ "تربیت" کے عنوان سے اقبال نے اپنے اس فکر کی ترجمانی اس طرح کی ہے ۔

زندگی کچھ اور شئے ہے علم ہے کچھ اور شئے
زندگی سوز جگر ہے علم ہے سوز دماغ
علم میں دولت بھی ہے قدرت بھی ہے لذت بھی ہے
ایک مشکل ہے کہ ہاتھ آتا نہیں اپنا سراغ
اہل دانش عام ہیں کمیاب ہیں اہل نظر
کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ

زندگی اور علم کے تجزیہ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ علم بجائے خود کوئی ضروری شئے نہیں بلکہ علم و زندگی کے ایک حسین امتزاج کی ضرورت ہے

وہ علم اپنے بتوں کا ہے آپ ابراہیم
کیا ہے جس کو خدا نے دل و نظر کا ندیم
زمانہ ایک حیات ایک کائنات بھی ایک
دلیل کم نظری قصۂ جدید و قدیم
چمن میں تربیت غنچہ ہو نہیں سکتی
نہیں ہے قطرۂ شبنم اگر شریک نسیم

وہ علم کم بصری جس میں ہمکنار نہیں　　تجلیات کلیم و مشاہدات حکیم

وہ علم جو صرف سوزِ دماغ کا نتیجہ ہو اس سے انسانیت کی وہ تعمیر نہیں ہو سکتی جو علم کا اصلی مقصد ہے۔ اس دور میں علوم و فنون تو بے انتہا بڑھ چکے ہیں زندگی کے ہر شعبہ کی علمی تحقیق ہو رہی ہے، اس پر موٹی موٹی کتابیں لکھی جا رہی ہیں۔ فن معیشت علوم سیاسیات، اصول معاشرت اور فلسفہ اخلاق غرضیکہ زندگی کے تمام شعبوں پر علیحدہ علیحدہ فن کی حیثیت سے غور و خوض اور تحقیق و تدقیق ہو رہی ہے۔ ایسی صورت میں انسان کو بحیثیت انسان جس قدر بلند ہونا چاہئیے وہ تو دور کی بات ہے اس کے برعکس خود غرضی نفس پرستی، انسان پر انسان کی حاکمیت کے جذبہ نے انسانیت کو جس عمیق غار میں پہنچا دیا ہے وہ آپ کی نظروں کے سامنے ہے۔ اس پر مزید دلائل و براہین پیش کرنے کی ضرورت نہیں، اس کا اصلی سبب یہ ہے کہ علوم و فنون تو بڑھ گئے۔ سائنس کی ترقی نے دنیا کے مادی عروج کو تو کہاں تک پہنچا دیا لیکن عمل، زندگی اور عشق باقی نہیں رہا اور در اصل انسانی ترقی کے راز بحیثیت انسانیت کے یہی ہیں

نگہہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کیلئے

اور یہ چیزیں مذہب و اخلاق کے عملی علم سے پیدا ہوتی ہیں۔ افسوس کہ

موجودہ نظامِ تعلیم نے اسی "مذہب و اخلاق" کی جڑ کاٹ دی ہے۔
ایسے نظامِ تعلیم کا "شجرِ خبیث" جس قسم کی ہوا دے گا اور اس سے جیسے
کڑوے کسیلے پھل برآمد ہوں گے وہ ظاہر ہے۔

گلا تو گھونٹ دیا اہلِ مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ اِلّا اللہ

موجودہ نظامِ تعلیم کی ایک دوسری بڑی خرابی یہ ہے کہ اسے صرف
دنیاوی زندگی کے سنوارنے کیلئے بنایا گیا ہے۔ حالانکہ اس میں بھی
"سنوار" تو کچھ زیادہ نہ ہو سکا البتہ زندگی کے "الجھاؤ" میں کچھ اور
اضافہ ہی ہو گیا۔

"**انسان** کی حقیقی زندگی صرف یہ نہیں ہے کہ وہ
بیرونی چیزوں کے اوصاف و خواص سے واقف ہو،
اور خود اس کے اندرونی اوصاف پر "پردہ" پڑا رہے
بلکہ اس کی اصل زندگی یہ ہے کہ خود اس کو اپنی ذات
یعنی اپنی خودی کے اوصاف و خواص "بے پردہ" نظر آئیں۔"

(اقبالِ کامل)

موجودہ علم و سائنس خواہ کتنی ہی ترقی کر جائیں لیکن ان کی
تگ و دو اور جد و جہد صرف انسان کے بیرونی اور خارجی دنیا تک

محدود ہے اسکی داخلی اور اندرونی زندگی سے انہیں کوئی مطلب نہیں، یہی وجہ ہے کہ سائنس میں مذہب و اخلاق کی آمیزش نہیں، اسلئے وہ زندگی کے ایک ضروری عنصر سے خالی ہے، اور جب تک انسان کو اپنی ذات یعنی اپنی "خودی" کے اوصاف و خواص بے پردہ نظر نہ آئیں اس وقت تک انسان میں حقیقی زندگی پیدا ہی نہیں ہو سکتی اور ہمارا موجودہ نظام تعلیم اس نقطہ نظر سے بالکل بانجھ ہے

اقبال مرحوم نے "علم و عشق" کے عنوان سے اس مسئلہ پر کتنی اچھی روشنی ڈالی ہے

علم نے مجھ سے کہا عشق ہے دیوانہ پن
عشق نے مجھ سے کہا علم ہے تخمین و ظن
بندۂ تخمین و ظن، کرم کتابی نہ بن
عشق سراپا حضور، علم سراپا حجاب

عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات
علم مقام صفات، عشق تماشائے ذات
عشق سکون و ثبات، عشق حیات و ممات
علم ہے پیدا سوال، عشق ہے پنہاں جواب

عشق کے ہیں معجزات سلطنت فقر و دین

عِشق کے ادنیٰ غلام صاحبِ تاج و نگیں
عِشق مکان و مکیں، عِشق زمان و زمیں
عِشق سراپا یقیں اور یقیں فتح باب

شرعِ محبت میں ہے عشرتِ منزل حرام
شورشِ طوفاں حلال لذتِ ساحل حرام
عِشق پہ بجلی حلال عِشق پہ حاصل حرام
علم ہے ابن الکتاب عِشق ہے امّ الکتاب

علم و عقل اور سائنس سے اگرچہ خارجی اور بیرونی دنیا کی تمام چیزوں کے اوصاف و خواص نمایاں ہو جاتے ہیں، لیکن خود انسان کے روحانی اوصاف و خواص پر پردہ پڑا رہتا ہے۔ عقل علم، سائنس بجلی کے چراغ جلا کر ساری کائنات کو تو روشن کر سکتے ہیں لیکن اس چراغ کی روشنی انسان کی روحانی زندگی تک نہیں پہنچ سکتی، اس کو صرف "عِشق" ہی کا دیا روشن کر سکتا ہے۔

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

ایسا نظامِ تعلیم جو نرے علم کی تعلیم دیتا ہو، زندگی و عشق کا درس جس میں نہ ہو تو پھر وہ علم "چارپائے بروکتابِ چند" کے مصداق ہے

اسی لئے آج کل کے تعلیمی ادارے کے متعلق حکیم مشرق علامہ اقبال یوں فرماتے ہیں

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک
نہ زندگی نہ محبت، نہ معرفت نہ نگاہ

سب سے اخیر میں شاعر مشرق علامہ اقبال کا وہ "پیام زندگی" بھی سُن لیجئے جو اُن نوجوان طالب علموں کو دیا ہے جو کبھی کبھی اور ایک جمود کی سی زندگی گذارتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ کرمِ کتابی بن کر رہ گئے ہیں۔ مگر وہ بھی اِلّا ماشاءاللہ۔

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

فقرِ اسلامی، اقبال کی نگاہ میں

فقر کیا ہے؟ اقبال کی زبان میں "یک نگاہ راہ بیں یک زندہ دل" اس ابہام کی تفصیل اسی مردِ فقیر کی زبان سُنئے۔

فقر کار خویش را سنجیدن است
بر دو حرف لا الٰہ پیچیدن است

فقر خیبر گیر با نانِ شعیر
بستۂ فتراک او سلطان و میر

فقر ذوق و شوق تسلیم و رضا است
ما امینیم ایں متاعِ مصطفےٰ است

یہ ہیں فقر کے معنی، یعنی فقر نام ہے ذوق و شوق اور تسلیم و رضا کا، اور یہی وہ سرمایہ ہے جو ہمارے رسول اکرم محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی امانت ہے
ایک مردِ فقیر روٹی تو جَو کی کھاتا ہے لیکن درِ خیبر اکھاڑ پھینکتا ہے

اب آیئے اور "مردِ فقیر" کے صفات بھی سُنئے، فقیر کو بادشاہوں کی پرواہ نہیں، اس کے بوریئے کے سامنے سلاطینِ وقت کے تخت لرز جاتے ہیں

ن کے دل میں جذب وسلوک کی وہ قوت ہوتی ہے کہ سلطان جابر کے سامنے
خوف وبے تامل "لاملوک" کا نعرۂ حق بلند کر کے استبدادیت وآمریت
ے چھکے چھڑا دیتا ہے ؎

سلاطین در رفتد مرد فقیر — از شکوہ بوریا لرزد سریر
طلب او ورا قوت از جذب وسلوک — پیش سلطاں نعرۂ او لا ملوک

یہ تو تھے مرد فقیر کے صفات! لیکن فقر مومن ہے کیا؟ فقر
ن کے پیکر علامہ اقبال فرماتے ہیں ؎

فقر مومن چیست؟ تسخیر جہات — بندہ از تاثیر او مولا صفات

اقبال کے نزدیک فقر وہ ہے جو بندے میں مولیٰ کے صفات
پیدا کرے، نہ کہ صرف سماع کی محفلوں میں وجد وحال اور رقص وسرود اور
سی فقر کی تعلیم قرآن نے دی ہے ' قرآنی فقر نام ہے احتساب کائنات کا !

فقر قرآں' احتساب ہست وبود — نے رباب ومستی ورقص وسرود

اس کے بعد علامہ اقبال نے مسلسل چند اشعار میں صحیح فقر کا نقشہ
در مومن وکافر کے فقر کا فرق پیش کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ فقر ورہبانیت
درمیان واضح خط امتیاز بھی کھینچ دیا ہے ؎

فقر کافر خلوت دشت ودراست — فقر مومن لرزۂ بحر وبراست
زندگی آں را سکون غار وکوہ — زندگی ایں را ز مرگ با شکوہ

آں خدا را جستن از ترکِ بدن | ایں خودی را چوں چراغ افروختن
فقر چوں عریاں شود زیرِ سپہر | از نہیبِ او بلرزد ماہ و مہر
فقرِ عریاں گرمیٔ بدر و حنین | فقرِ عریاں بانگِ تکبیرِ حسین

فقر رہبانیت نہیں ہے جو خودی کو جلا دے بلکہ وہ سوز و ساز ہے جو چراغ کی طرح روشن ہے ۔ مہر و ماہ کی ظاہری چمک دمک فقرِ عریاں کے سامنے لرزہ باندا ہو جاتی ہے ۔ اور یہ فقرِ عریاں " وہ ہے جس کی تہی دستی اور بے سر و سامانی نے بدر و حنین میں شانِ جلالی دکھلائی ، اور یہ فقرِ عریاں وہ ہے جس نے تشنہ لبیٔ حسین کی شعلہ نوا تکبیر سے خرمنِ ملوکیت کو خاکستر کر دیا ، مگر آہ ، جب ہمارے فقر میں وہ ذوقِ عریانی نہیں رہی تو وہ جلال مسلمانی بھی رخصت ہو گیا۔

فقر را تا ذوقِ عریانی نماند
آں جلال اندر مسلمانی نماند

ضرورت ہے کہ اب " فقر " پر ذرا تفصیلی روشنی ڈالی جائے۔ فقر کے معنی صرف محتاجی و مفلسی کے نہیں ہیں ، ایک مردِ مومن کا فقر مال و دولت ، عزت و جاہ ، منصب و منزلت سب کو ٹھکرا دیتا ہے۔ دنیا کی ظاہری چمک دمک اور عزت و دولت سے بلند ہو جاتا ہے۔ اس کا ووش کسی کے بارِ احسان سے دبا نہیں رہتا ، وہ غیروں کا احسان کسی حال میں بھی اٹھانے کے لئے تیار نہیں ، اسی کی بدولت اس کی سیرت میں بے نیازی

بے خوفی ہمیشہ موجود رہتی ہے، اقبال نے اسے اس طرح بیان کیا ہے ؎

فقر کے ہیں معجزات تاج و سریر و سپاہ
فقر ہے میروں کا میر فقر ہے شاہوں کا شاہ

فقر مقام نظر، علم مقام خبر
فقر میں مستی ثواب علم میں مستی گناہ

علم کا موجود اور فقر کا موجود اور
اشہد ان لا الٰہ اشہد ان لا الٰہ

اسی بات کو ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں ؎

مرا فقر بہتر ہے اسکندری سے
یہ آدم گری ہے وہ آئینہ سازی

اسی فقر کی مزید تفصیل اس طرح کرتے ہیں ؎

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری
اک فقر سے کھلتے ہیں اسرار جہانگیری

اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری
اک فقر سے مٹی میں خاصیت اکسیری

اک فقر ہے شبیری اس فقر میں ہے میری
میراث مسلمانی، سرمایۂ شبیری

مسلمانوں کی موجودہ خواری وپستی اور زبوں حالی کو دیکھ کر علامہ اقبال نے
اُن کے لیے نسخہ بھی "فقر" ہی کا تجویز کیا ؎

خوار جہاں میں کبھی ہو نہیں سکتی وہ قوم
عشق ہو جس کا جسور فقر ہو جس کا غیور

موجودہ زبوں حالی اور پستی کا سبب اسی کو بتاتے ہیں ؎

کیا گیا ہے غلامی میں مبتلا تجھ کو
کہ تجھ سے ہو نہ سکی فقر کی نگہبانی

اور پھر اسی فقر کے کھو دینے کا شکوہ بھی کرتے ہیں ؎

یہ فقر مردِ مسلماں نے کھو دیا جب سے
رہی نہ دولت سلمانی و سلیمانی

اقبال اُس فقر کا قائل نہیں تھا، جس کا دوسرا اصطلاحی نام
گداگری، رہبانی، سرافگندگی اور سربزیری ہے بلکہ اس نے فقر قرآنی کو
اپنایا اور اسی کی دعوت دی ؎

جز بقرآں ضیغمی روباہی است
فقر قرآں اصل شاہنشاہی است

رہبانیت وگداگری اور سرافگندگی وسربزیری اقبال کی نگاہ میں سب سے بڑی
انسانی پستی ہے، جس سے بچنے کی وہ دعوت دیتا ہے

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری
کہ فقر خانقاہی ہے فقط اندوہ ودلگیری

حذر اس فقر و درویشی سے جس نے
مسلمانوں کو سکھا دی سربزیری

اور خود بھی اُن سے علیحدگی اور برأت کا اظہار کرتا ہے ؎

میں ایسے فقر سے اے اہلِ حلقہ باز آیا
تمہارا فقر ہے بے دولتی و رنجوری

اقبال کے فقر کا تصور سائل و گداگر کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ اصول فقر پر عمل کرنے والا سائل نہیں ہو سکتا، اسکا دل بے نیاز ہر دو جہاں سے غنی ہوتا ہے ؎

ہمت ہو اگر ڈھونڈ وہ فقر
جس فقر کی اصل ہے حجازی

اس فقر سے آدمی میں پیدا
اللہ کی شان بے نیازی

اور اقبال اس غلط فہمی اور جہل کو بھی دور کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ فقر رہبانیت کا نام نہیں، جیسا کہ تم نے دونوں کو ایک سمجھ رکھا ہے بلکہ فقر فقر ہے اور رہبانیت رہبانیت! دونوں میں بعد المشرقین ہے ؎

کچھ اور چیز ہے شاید تری مسلمانی
تری نگاہ میں ہے ایک فقر و رہبانی

سکوں پرستی راہب سے فقر ہے بیزار
فقیر کا ہے سفینہ ہمیشہ طوفانی

فقر اور راہبی و گدائی کا فرق واضح اور روشن ہے۔ اس کے باوجود بھی اگر کسی نے گدایانہ روش اختیار کرلی ہے اور اپنے تئیں اس غلط فہمی میں مبتلا کر کے میں "مقام فقر" طے کر رہا ہوں تو اس پر صد ہائے حسرت و افسوس کہا او کیا کہئے؟

مقام فقر ہے کتنا بلند شاہی سے
روش کسی کی گدایانہ ہو تو کیا کہئے

اقبال کے فلسفۂ فقر کا ایک سرسری جائزہ لینے کے بعد یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ اقبال کا "فقر" "فقر اسلامی" ہے۔ جو قرآن کے عین مطابق ہے

اسی اسلامی فقر کی تمام خصوصیات اقبال کے شاہین میں پائی جاتی ہیں، اسی لئے اقبال بلبل و قمری کی تشبیہوں کے بجائے عقاب اور شاہین کو ترجیح دیتا ہے جیسا کہ اقبال نے اپنے ایک خط میں اس کا اظہار کیا ہے۔

"شاہین کی تشبیہہ محض شاعرانہ تشبیہہ نہیں ہے، اس جانور میں اسلامی فقر کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں ۱۔ خوددار اور غیرت مند ہے کہ غیروں کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا، ۲۔ بے تعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا ۳۔ بلند پرواز ہے ۴۔ خلوت نشیں ہے، ۵۔ تیز نگاہ ہے۔"

یہ پانچ صفات جو شاہین میں پائی جاتی ہیں، دراصل اسلامی فقر کے صفات ہیں، اسی لئے اقبال نے "اسلام" کو "فقر غیور" سے بھی تعبیر کیا ہے۔

لفظ اسلام سے یورپ کو اگر کد ہے تو خیر
دوسرا نام اسی دین کا ہے فقر غیور

کتبہ:- قمر نظامی۔ معروف گنج، گیا